

اللی کے شہر روم میں صبح ابھی پوری طرح سے طلوع
نہیں ہوئی تھی۔ گذشتہ روز سے بارشوں کا جو سلسلہ چل
رہا تھا، اس کی وجہ سے کہیں نہ کہیں ابھی بھی آسمان
پر کالے اور سدمئی بادلوں کا ڈیرہ تھا۔ گو کہ آج ان کا
بردنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

لیکن موسم انتہائی دلکش اور ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ بلکہ سی
دھنڈ نے بھی چاروں اور اپنا تسلط جمایا ہوا تھا۔ جھوم
جھوم کر آتی ہوا موڑ پر ایک خوش گوار اثر ڈال رہی تھی۔
ایسے میں وہ صاف ستھری سڑک پر دوڑتا جا رہا تھا۔ جو
رات ہوئی بارش کی وجہ سے ابھی بھی گیلی محسوس
ہوتی تھی۔ سیاہ ٹرینکنگ سوٹ میں ملبوس، ہڈی کی
آستینیوں کو کھینیوں تک کھینچے، پیشانی پر بکھرے اپنے
رف کننگ بالوں کو وہ ہاتھ سے پیچھے کی جانب کرتے ہوئے
دونوں اطراف میں سرخ مخدوطی چھتوں والے لکڑی کے ڈبل
اسٹوری گھر بنے تھے۔ جن کی بالکنیوں میں خوش نما
پھولوں کے گملے رکھے تھے۔ اگے سے وہ سڑک نشیب
کی جانب جاتی تھی۔ جس کے اختتام پر ایک اوپن ائیر
کیفے بنتا تھا۔ صبح صبح کا وقت تھا، اس لئے رش نہ ہونے
کے برابر تھا۔ ورنہ تو سارا دن ہی وہاں گھما گھمی کا راج
ہوتا تھا۔ نازی کافی اور ڈونٹس کی مہک سارے میں پھیلی

ہوئی تھی۔ لکڑی کی چٹید گھسیٹ کد بیٹھتے ہوئے اس نے ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے ویڈ کو کافی لانے کا اشارہ کیا۔ جو اثبات میں سر ہلاتا اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ چند دنوں سے وہ اس کیفیت کا ڈیلی کستم بر چکا تھا۔ اس لئے ویڈ اس کے پتاۓ بغیر ہی اس کی مطلوبہ کافی لے آیا تھا۔

بڑ سر پر گدائے وہ ہاتھ میں پکڑے فون پر نظریں جھکائے پاکستان سے آئیں ای میلز اور والنس ایپ کے میسجز دیکھ رہا تھا۔ جو اسے روزانہ کی بنیاد پر ہی ڈھیندوں کی تعداد میں موصول ہوتے تھے۔ سیدھے ہاتھ کی مٹھی بنا کر گال تلے رکھے ایک ندم سی مسکدابھ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔ اس کی میز پر رکھے اس کی کیپے چینو کے کپ سے دھوئیں کے مرغولے سے اڑ کر فضاء میں خوشبوں بن کر گھل رہے تھے۔

اس کے کم سے میں رات ابھی تک ٹھہری ہوئی تھی۔ کھڈکیوں پر دبیز پر دے پڑے تھے۔ پورے روم میں نیم اندھیرے میں خوابناک ماحول تھا۔ جب اس نے پر دے ہٹا کر کھڈکیوں کے پٹ کھول دے تھے۔ تازہ ہوا کے ساتھ صبح کی دو پہلی گرنوں نے تیزی سے وہاں اپنا تسلط جمانا شروع کر دیا تھا۔ ندم سی روشنی نے چہرے کو چھوا تو اس

نے نیند میں کسمساتے ہوئے بلینکٹ سے چھڑہ ڈھانپ لیا۔
لیکن ایک دلفریب سی مہک نتھنوں سے ٹکرائی تو اس نے
چیدہ بلینکٹ سے نکال کر ذرا کی ذرا گردن موڑ کر نیم کھلی
آنکھوں سے سائیڈ ٹیبل کو دیکھا، جہاں پانچ سے چھٹے تازہ
گلابیوں کو رین سے باندھ کر ایک چھوٹے سے بکے کی شکل
دی گئی تھی۔ پورے کمدے میں ان کی بھیں بھیں سی
خوبیوں پھیلی تھی۔ ”گڈ مارننگ!“ تبھی وہ شاور لے کر
تولیے سے گیلے بال رکھتے ہوئے باہر آیا۔ اسے جاگنے
دیکھا تو وہ کیا۔

”میں اس دن کے انتظار میں ہوں، جب لیزا تمہیں اپنے
باغیچے سے پھول چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے
گئی۔“ بیڈ گداون ٹیک لگائے وہ بیزٹ گرین آنکھوں میں
مصنوعی خفگی لئے اسے دیکھ کر بولی۔ ہاتھوں میں ہی
گلاب پکڑ رکھتے تھے، جنہیں ناک کے قدیب کئے سونگھ
رہی تھی۔

”لیزا دیر سے اڑھنے کی عادی ہے۔ میں اس کے جاگنے
سے پہلے ہی اپنی کاروائی کر چکا ہوتا ہوں۔ وہ محض
کبھی رنگے ہاتھوں نہیں پکڑ سکے گی۔“ گیلے بالوں میں
جیل لگاتے، وہ ڈریسنگ مدر میں سے زرنور کو دیکھتے ہوئے
وہ سادگی سے اطمینان بھرے انداز میں بولا۔
”ویسے بھی شاید اسے معلوم ہے کہ اس کے باغیچے سے

پھول غائب کرنے والا میں ہی ہوں۔ جبھی تو وہ مجھ سے
اتنے رعب سے گانا سنائے کی فرمائش کرتی ہے " - زنور
نے چونک کہ اسے دیکھا - تم لیزا کو گانا سنائے ہو ؟"
" ہاں ! جب تم سو رہی ہوتی ہو یا پھر کوئی بک پڑھ رہی
ہوتی ہو تو میں بور ہو جاتا ہوں - اس لئے پھر گتار لے کر
لیزا کے پاس چلا جاتا ہوں - وہ میدے لئے کافی بناتی ہے
اور میں اسے گانا سناتا ہوں - اس کا موڈ شدید خراب ہو چکا
ترہا، کوئی ذرا اس کے شوہر کی معصومیت دیکھتا -
" کیا ہوا ؟ بدرش سے بال سیٹ کرتے ہوئے اس نے آبدو کے
اشارے سے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا -
" تم - - تم اس کے بلانے پر گانا سنائے جاتے ہو احمد ؟
مارے صدمے اور شاک کے اس سے ٹھیک سے بولا بھی نہ
کیا۔ نہیں نور --- اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی
جانب رخ موڑا -
وہ نہیں بلائی بلکہ میں خود جاتا ہوں - اس کے تصحیح کرنے پر
زنور کا مزید خون کھو لا تھا -
" اور ہاں ! ادھ کافی بہت مزیدار بناتی ہے - شاید یہی وجہ
ہے جو مجھے بار بار اس کے پاس لے جاتی ہے " - شانے
اچکاتے ہوئے سادگی سے بتا رہا تھا - اس کے چہرے سے
یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ صرف اسے ستا رہا ہے -
میں تمہیں بھی لے کر جاتا اس کے گھر ، لیکن تم کافی

پیتی ہی نہیں ہو تو اس لئے -- "احمد کے مزید الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے تھے کیونکہ زرور نے وہی چھوٹا سا بکے اسے کھنچ مارا تھا۔

کیا کد رہی ہو یار؟ میں اتنی محنت سے تمہارے لئے چدا کر لاتا ہوں اورب کہ اگر لاتا ہوں اور تم ایسے ناقدری کرو گی؟" وہ خفا ہوا۔

جب اپنی پڑوسن کو گانا سنانے جاؤ گے ناہ تو اس کے لئے لے جانا۔ وہ اشتغال سے بولی -

"اچھا تو اب میں اس کے گارڈن سے گلاب چدا کد اس کے لئے ہی لے کد جاؤں؟ کتنی غیر اخلاقی حرکت ہے - تو خدید کد لے جانا سامنے سے - جلد کر مشورہ دیا گیا تھا۔ گذ آئیڈیا ناشتے کے بعد ۲م اس کے لئے اچھے سے پھول خردینے چلیں گے۔

"احمد!" صدمے سے اس کا منہ کاٹ کھلا -

وات؟" اس نے ناسمجھی سے زرور کو دیکھا۔

بات نہیں کرنا اب تم مجھ سے اب" - غصے سے اسے گھوڑتے ہوئے وہ بلینکٹ ہٹا کر نیچے اتھی۔ پھر پیدوں میں سیلپرڈ ارسٹے ہوئے ہاتھ روم میں چلی گئی۔ اپنے پیچھے زوردار آواز میں دروازہ بند کرنا نہیں بھولی تھی۔ سر جھٹکتے ہوئے وہ بے ساختہ پنسا تھا۔

بداؤں شال اپنے گرد لپیٹے وہ ابھی بھی خفا سی تھی۔
ناشترے کے لئے وہ دونوں ایک مقامی اوپن ائیر ریسٹورنٹ
میں بیٹھے تھے۔ صبح کے سارے دس بجے کا وقت تھا۔
تاریخی شہر روم میں معمولات زندگی شروع ہو چکے تھے۔
پوری دنیا سے آئے سیاح روم کی خوبصورتی کو ستائشی
نظردوں سے دیکھتے یہاں وہاں گھوم رہے تھے۔
کل صبح کی ٹکٹس کنفرم ہو گئیں ہیں۔” موبائل آف کد کے
سائیڈ پر ڈالتے ہوئے اس نے بتایا۔

کل صبح کی؟” اس نے ناراضگی بھلانے چونکہ کد پوچھا۔
”لیکن ہم تو پندرہ دن کے لئے آئے تھے احمد! اور ابھی تو
ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا۔“ وہ شاکی سا بولی۔
”تو کیا ہوا؟“ ہم دوبارہ آجائیں گے نا۔ محقق نہیں جانا
ابھی واپس۔ سینے پر بازو باندھے اس نے پھر منہ پھلا لیا۔
”آئی پرداںس یار! کچھ ٹائم بعد میں دوبارہ لے آؤں گا تمہیں
یہاں لیکن ابھی جانا ضروری ہے۔ تمہیں میدے پارٹنر کا تو
پتا ہے نا۔ اگر میں پاکستان نہ پہنچا تو اس روئے زمین
سے خانزادہ انڈسٹریز کا نام و نشان مٹ جانا ہے اور پھر ان
دونوں کی شادی کی ڈیٹ بھی تو فکس ہونے والی ہے۔“

کافی کا مگ اپنی جانب کھسکاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا لیکن
دوسری طرف حیرت انگیز طور پر خاموشی رہی۔ اس نے
سر اڑھا کر زرنور کو دیکھا، جو ہیزل گر میں آنکھوں میں غصہ

اور ناراضنگی لئے اسے گھوڑ رہی تھی۔

"نور!" احمد نے ندمی سے اسے مخاطب کیا تھا لیکن
یخلت ہی وہ چئید دکھیل کر اٹھ کھٹی ہوئی اور ایک تیز نظر
اس پر ڈالتی وہ آگے بڑھ چکی تھی۔

وہ بوکھلا کر اٹھا، پھر جیکٹ کی جیب سے والٹ نکال کر،
اس میں سے کچھ نوٹ نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے جلدی
سے اس کے پیچھے بھاگا۔ جو رش میں تقدیبا گم ہو چکی
تھی۔ ان کا ناشتہ وہیں رکھا ٹھہنڈا ہو چکا تھا۔ رش میں سے
جگہ بناتا وہ اسے آوازیں دیتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگ رہا
تھا۔ جو بغیر پیچھے مت لب بھینچے، کان لپیٹے چلتی
جارہیں تھیں۔

"اسٹاپ اٹ یار!" اس نے زرنور کو پیچھے سے بازو سے
پکڑ کر روکا۔

"لیو می! مجھے تمہاری شکل نہیں دیکھنی۔ میدے پیچھے
مت آؤ"۔ اس کی گدفت سے بازو چھڑواتے ہوئے، وہ
سختی سے بولی۔

"اوکے ہم دو دن بعد چلے جائیں گے"۔ اس کا انداز
خوشامدی تھا۔

سپاٹ چھدے کے ساتھ وہ دو قدم آگے بڑھا کر اس کے
سامنے آئی تھی۔ آس پاس کی ساری آوازیں، سارا شور
کھیں پس منظر میں چلا گیا تھا۔ اپنے ہاتھ اس کے سینے پر

رکھے وہ اس کی گدے آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ مسترد
ارمان احمد خانزادہ!

"جی میدی نور!" وہ سو جان سے متوجہ ہوا۔
"جهنم میں جاؤ تم۔" چبا کد کہتے ہوئے وہ ایک قہبار سی
نگاہ اس پر ڈال کد پھر آگے بڑھ گئی تھی۔

کافی دید کی تلاش کے بعد وہ اسے ایک شاپ کے سامنے
کھڑی نظر آئی تھی۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کد انگریزی میں کاؤنٹر
کے لیے کھٹے لڑکے کو کچھ سمجھائے کی کوشش کر
رہی تھی۔ جبکہ ایلین نقوش والا، وہاں کا مقامی لڑکا بے
بسی سے افسوس میں سر بالا رہا۔ اٹلی گو کہ ایک
سیاحتی ملک تھا۔ پوری دنیا کے لوگ وہاں آتے تھے لیکن
اس کے باوجود بھی وہاں کے شہری انگریزی زبان سے زیادہ
اپنی زبان ہی فوقیت دیتے تھے۔ "ایکسکیووڈ میں!" احمد
نے اسے شانوں سے پکڑ کد سائیڈ پر کیا تھا۔
جو اس کی آمد سے انجان چونک اٹھی تھی۔ لیکن اس کی
آنکھوں میں پھر سے غصہ امڈ آیا تھا۔ سینے پر بازو لپیٹے
وہ قدرے ایک طرف کھڑی احمد کو ایلین زبان میں خود کا
آرڈر لکھواتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جو وہ پچھلے بیس منٹ
سے اسے نہیں سمجھا پائی تھی، وہ احمد نے چند سیکنڈ
میں کر دیا تھا۔

”پلیز!“ کچھ دیر بعد وہ ایک خالی ٹیبل کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے منت سے اسے کہہ رہا تھا، جو تاثرات میں نرمی لائے بغیر سد جھٹکتی میڈ کی جانب آگئی تھی۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ جانے تم کہاں چلی گئی ہو۔ اگر گم ہو جاتیں تو میں روما میں کہاں ڈھونڈتا تمہیں؟“ وہ چئید گھسیٹ کہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ احمد کی پیاری نور نے اسے چار گھنٹے روم کی سڑکوں پر خوار کروایا تھا۔ ڈھونڈنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھ سے جان چھوٹ جانے پر خوشی مناتے ہوئے پہلی فلاٹیٹ پکڑ کر اپنے دوستوں کے پاس چلے جاتے۔ وہ چباتے ہوئے بولی۔ ”وہ میرے دوست ہیں۔“ احمد نے تھکان بھردی بے بسی سے کہا۔ جانے کیوں وہ ان سے اتنا چٹائے لگی تھی۔

”اور میں کون ہوں؟“ اس نے طندا پوچھا۔

”آپ میری بیوی ہیں۔“ احمد نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اوہ! آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔ لیکن آپ کو مجھ سے اتنی محبت نہیں ہے، جتنا اپنی کافی اور اپنے دوستوں سے ہے۔“ ویژد ان کا آرڈر سرو کر رہا تھا جبھی اس نے آواز کو دھیما رکھا تھا لیکن لہجہ پر تپیش تھا۔ ”اب اگر میں کہوں کہ تم سچ کہہ رہی ہو تو تم نے پرہ ناراض ہو جانا ہے۔ امیریکانوں کافی کے مگ سے گھونٹ بھرتے ہوئے۔ اس نے شانے اچکا کر اسے دیکھا۔ لیکن گرے

آنکھوں میں بلا کی شدارت چھک رہی تھی۔

ٹیک یور لنج لیڈی! بعد میں بحث کریں گے" - احمد نے اس کے سرخ پڑتے چھے کو نظر انداز کر کے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تھا، جہاں وائٹ ساس شرمنپ پاستا اور بھاپ اڑاتی کدیمی کافی اس کی منتظر تھی۔

گھدی سانس بھد کر غصے کے بہت سے گھونٹ اپنے اندر اتار کر، پلیٹ اپنی طرف کرتے ہوئے وہ اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اسے مکمل نظر انداز کرتی وہ کھانے کے ساتھ ساتھ وہاں کی قدیم اور اونچی پر شکوہ تاریخی عمارتوں کو بھی دیکھ رہی تھی۔ جن میں کھڑکیاں کثیر تعداد میں تھیں۔

لنج کے بعد وہ اسے لے کر "Spanish steps" آیا تھا جو خاصی بڑی اور کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ ان کے آغاز میں ہی سامنے ایک کشتی کی صورت کا خوبصورت سا فاؤنٹین تھا۔ وہاں آئے والے سیاح اسے دیکھ کر اور بہت سی تصاویر بنوانے کے بعد ہی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے تھے، جہاں دو میناروں والا قدیم تاریخی چرج تھا۔ دلکش آرکیٹیکچر، آرٹ اور تاریخ تو اٹلی میں قدم قدم پر بکھری ہوئی تھی۔ اس کا موڈ قدرے بحال ہو چکا تھا، غصہ اور

ناراضنگی بھلائے اب وہ دوسرے سیاحوں کی طرح شوق و
دلچسپی سے ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے اپنے فون میں ان
کی تصاویر بنانے رہی تھی "احمد دیکھو ناہ یہ فاؤنٹین کتنا
پیارا ہے۔" وہ بچوں کے سے اشتیاق سے اس کا بازو پکڑے
قریب لے آئی تھی۔ میدی اب تک کی پوری زندگی انہیں
دیکھتے ہوئے ہی گزری ہے۔ میدے لئے یہ کچھ نیا نہیں ہے
۔ جیسے کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، چلتا ہو اور لاپرواہ سا بولا۔
"مجھے معلوم ہے لیکن میں پہلی بار یہاں آئی ہوں۔ اس
لئے تم بھی ایسے پوز کرو کہ جیسے تم بھی میدی طرح
پہلی بار یہ سب دیکھ رہے ہو۔ آئی سمجھ؟" ہوا سے
اڑکلیاں کرتے اپنے بالوں کو ایک ادا سے جھٹکتے ہوئے وہ
دھونس دیتے ہوئے بولی۔ ایک لمحے کو وہ اس کا انداز ہی
دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے کے تاثرات کچھ بدلتے
تھے۔

"اوہ ماٹی گاڈا! یہ فاؤنٹین کتنا زبردست ہے۔ میدی ایک پکچر
تو بناؤ یا۔" دوسرے ہی لمحے فوارے کے کنارے بیٹھتا وہ
سیدھا ہاتھ پانی میں ڈالے شوق سے اسے کہہ رہا تھا۔
زرنور بے ساختہ ہنسی تھی۔

"کتنے ڈرامے باز ہو تم حیدر کی طرح۔"

"میں چاہوں بھی تو اس کے جیسا نہیں بن سکتا۔ نور بانو!"
اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ سادگی سے بولا لیکن

آخذ میں "نور بانو" کہتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکدابٹ صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ جبکہ وہ اپنی جگہ ٹھہر گئی تھی۔

تم نے -- تم نے مجھے -- مجھے نور بانو کہا احمد؟" وہ بے یقین تھی۔ شدید بے یقین۔ وہ جو زرنور کے کہنے پر ہمیشہ حیدر کو ڈانتا آیا تھا کہ اسے نور بانو نہ کہا کرے اور آج خود اسے کہہ رہا تھا۔

کیا ہوا؟ صرف نور بانو ہی تو کہا ہے۔

"صرف نور بانو کہا ہے؟" اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں تھیں ضبط سے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے یہ نام کس قدر زہد لگتا ہے؟" اس کے چہرے پر پھر دبا دبا غصہ جھلکنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کا گلا دباتی احمد وہاں سے بھاگ اڑھا تھا۔

احمد! رک جاؤ تم -- احمد "لوگوں کے درمیان سے جگہ بنا کر وہ ہنستے ہوئے زد نور کو اسی فوارے کے گرد بھاگتے ہوئے اپنے پیچھے دوڑا رہا تھا۔ وہاں موجود سارے سیاح اور مقامی لوگ بھی دلچسپی سے انہیں دیکھتے ہوئے ہنس رہے تھے۔

شام کے ٹھنڈے سائے کراچی شہر میں پھیلنے لگے تھے۔
شاہ آفتاب سارا دن اپنی حکمرانی دکھا کر اب غدوں ہونے

کی تیاری کر رہا تھا۔ پرندوں کے غول بھی تھک ہار کر اپنے گھروں کو لوٹ دے رہے تھے۔ ایسے میں خانزادہ انڈسٹریز کی اس پر شکوه عمارت کے اندر ابھی بھی ورکڈ موجود دکھائی دے رہے تھے۔ نائن ٹو فائیو جاپ کرنے والا وہ استدراff سازھے چڑھنے کے بعد بھی ابھی وہیں موجود تھا۔ لیکن زدا جھانک کر دیکھو تو سب ہی بیزاری اور ناخوشی سے جلدی جلدی کام نباتے نظر آ رہے تھے۔ کوئی بذبڑا سے ہوئے لیپ ٹاپ لئے بیٹھا تھا تو کوئی کاغذوں کے پلندے سنبھالنے میں بے حال ہو رہا تھا۔

سامنے سے ایک تینس چوبیس سال کا لڑکا ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے ٹرے میں "ٹیک اوے" کا ڈبہ اور کولا کین رکھے، اس دروازے کے سامنے کھڑا دستک دے رہا تھا جس پر "سی ای او" کی تختی لگی تھی۔ چھے سے وہ بھی ناخوش لگنا تھا۔ کچھ دنوں میں اس کی شادی ہونے والی تھی جس کی تیاری کرنے کے لئے اس نے ایک ہفتے سے چھٹی کی درخواست دے رکھی تھی جو کہ ابھی تک منظور نہیں ہوئی تھی۔ اجازت ملتے ہی وہ دروازہ دھکیلتا اندر آیا تھا۔ جو کہ ایک پر تعیش سا بلیو اور گدے کلد کے امتزاج کا خوبصورت انڈریڈ والا روم تھا۔ گلاس وال کے پاس ایک بڑا سا فشن ایکویریم بھی رکھا تھا، جس میں رنگ بدنگی نایاب مچپایاں تیدتے ہوئے اس وارد کو دیکھ رہی تھیں۔ گلا

کھنکھاڑتے ہوئے وہ اس کے پاس آیا تھا، جو پاور چئید پر نیم
دراز سامنے بٹی سی شیشے کی میڈ پر دونوں پید قینچی
صورت بنائے گود میں لیپ ٹاپ رکھے بیٹھا تھا
بولو کیا مسئلہ ہے؟" نظریں اڑھائے بغیر وہاں سے پوچھا
گیا۔ وہ سد میں نے آپ کے لئے -- یہ آرڈر کیا تھا۔

خوشامدی مسکداہٹ لبیوں پر سجائے اس نے دو قدم آگے
بڑھ کر ٹھے اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ اس نے ایک نظر
اس ڈبے پر ڈالی تھی پھر ایک کان میں لگی ہینڈ فری کو
کھنچتے ہوئے وہ زیر لب مسکراتا سیدھا ہو کر بیٹھا۔
ڈبل چیز بدگد ہونا چاہئے - "لیپ ٹاپ سائیڈ پر کرتے ہوئے
وہ جیسے باور کروا رہا تھا۔

عین آپ کی پسند کے مطابق ہے سر۔"
اوکے تم گھرد جا سکتے ہو ناصد - "کولا کا کین کھولتے ہوئے
اس نے جیسے آزادی کا پروانہ تھما�ا تھا۔
واقعی میں سد؟ میں آف کرلوں؟" اسے یقین نہیں آ رہا
تھا کہ اس کی ٹدک کام کر گئی ہے اور اس کا بھکڑ بس
اسے جانے کی اجازت دے رہا ہے۔

ہاں بلکل! تم جاسکتے ہو ناصد لیکن پہلے یہ فائل کمپلیٹ
کر کے مجھے آہے گھنٹے میں میل کرو۔ اس کی اگلی
بات پر ناصد کی مسکداہٹ سمت گئی تھی۔ سد پہلے ہی
اتنا لیٹ ہو گیا ہے۔ میں کل لازمی یہ کمپلیٹ کر دوں گا۔"

بے بسی سے وہ روپانسا ہو گیا تھا۔ چہ چہ بے چارے
کی رشوت صنائع چلی گئی تھی۔

کل نہیں۔" برگد کا بڑا سا بائیٹ لیتے ہوئے اس نے نفی
میں سد پلایا۔ آج ہی چاہئے۔ ابھی ہی چاہئے۔ " پر شکوہ
کی نگاہ اس پر ڈال کر دو فائیڈ میز سے اٹھاتے ہوئے باہر
نکل آیا تھا۔ پتا نہیں کب جان چھوٹے گی اس مصیبت سے
بڑبڑاتے ہوئے وہ اپنے کیبن کی جانب چلا گیا تھا۔

جبکہ دوسرا طرف کوٹ بازو پر ڈالی، ٹائی کی ناٹ
ڈھیلی کرتا تھکان زده سا وہ سیڑھیاں چڑھتا اوپر کی منزل
پر آیا تھا جو کہ بلڈنگ کا مین فلور تھا۔

واٹ ہیپنڈ گائیڈ؟ ابھی تک یہاں کیا کہ رہے ہو؟ رست واج
دیکھتے ہوئے اس نے حیدانگی سے چاروں اطراف میں
نظریں دوڑاتے ہوئے ان سب کو دیکھا تھا۔ جن کی کچھ دید
پہلے کی بیزاری اب اس کا چہرہ دیکھتے ہی جوش میں بدل
چکی تھی۔

"ریاض سد! اُس ٹو مج! ہمارے جاب کانٹریکٹ میں نائین ٹو
فائیو کا ٹائم ڈوریشن تھا۔ لیکن حیدر سد نے ہمیں کب سے
"جبس بے جا" میں رکھا ہوا ہے۔ وہ ہمیں گھر نہیں جانے
دے رہے۔ وہ اپنا کام بھی ہم سے کدوا رہے ہیں۔ اور خود
اندر ارمان سد کے روم میں بیٹھ کر مووی دیکھ رہے ہیں"۔
سب اپنا کام چھوٹے اس کے گرد گھیردا ڈال کر کھٹے

ہو گئے تھے۔ جو دوپہر سے میٹنگ کے لئے گیا ہوا تھا اور ابھی واپس آیا تھا۔ ان بیچاروں کے دکھٹے سن کر اسے ہنسی آرہی تھی لیکن ضبط کر گیا تھا کہ کہیں وہ اس سے بھی شاکن نہ ہو جائیں۔

"حیدر کی غیبتیں کرو گے تو سیدھا جہنم میں جاؤ گے سارے۔ تبھی وہ ارمان کے روم سے باہر لکھتے ہوئے ان کے پاس آیا۔

"چلو سب اپنی سیٹس پر واپس جاؤ۔ گیارہ بجے سے پہلے کوئی جانے کا نام بھی نہیں لے گا۔ کل اتنی اہم میٹنگ ہے۔ کدوڑوں کی ڈیل سائنس کی ہے۔ کوئی مذاق تھوڑی ہے۔" "سدھم نے سارا پیپر ورک، اور آپ کی پریزنسٹیشن تک تیار کر لی ہے۔ اس کے علاوہ داؤڈ اینڈ سنڈ اور ملک انڈسٹریز کی کب سے پنیڈنگ میں پڑی فائلز کی ساری پرالیم بھی سوٹ آؤٹ کر دی ہے۔ کل آپ سائیٹ پر جا کر اس کا جائزہ بھی لے سکتے ہیں۔" "احمد کی سیکریٹری، حیات نے کچھ فائلز لا کر ریاض کے سامنے رکھی تھیں۔

"ہم نے اگلے ایک ہفتے تک کا کام آج ہی ختم کر لیا ہے۔ اب تو ہمیں گھر جانے دیں سد پلیز!" اس نے ہاتھ نہیں جوڑے تھے لیکن انداز منت بھدا ہی تھا۔

"کام وام پکچھہ ہوتا نہیں تم لوگوں سے، بس بھاگنے کی پڑی رہتی ہے۔ تمہارا بس آجائے تو بتاؤں گا اس کو کہ کتنا

کام چور استاف ہے اس کا حیدر کے تنک کد کھنے پر ان سب نے پھر شکایتی نظرلوں سے ریاضن کو دیکھا۔

"کوئی مسئلہ نہیں۔ گھر جاؤ سب۔" اس کا کہنا تھا کہ سب منٹوں میں بھاگم بھاگ اپنا سامان سمیٹ کر لفت کی جانب بڑھے تھے اور جنہیں ان سے بھی زیادہ جلدی تھیں، وہ لفت آئے کا انتظار کئے بغیر سیڈھیوں کی جانب بھاگے تھے۔ حیدر سے کچھ بعید نہیں تھا کہ پھر سے انہیں روک کر وہاں قید کر دیتا۔

"تو سدھے گا نہیں کارٹون؟" ریاضن سے اسے گددن میں بازو ڈال کر جھٹکے سے قریب کیا تھا۔

"اگر احمد کے آئے سے بھلے یہ سب تیرے ظالمانہ روئے کی وجہ سے بھاگ گئے تو کیا جواب دیں گے اسے! ۶۴؟ سوری ٹو سے باس! لیکن میں اس کمپنی کا بیس فیصد شیئر ہولڈر ہوں اور میں کسی کو جواب دہ نہیں ہوں۔ اس کی گرفت سے خود کو چھڑوانے کے بعد وہ کوت ٹھیک کرتا مفترور سا بولا۔

آئی تھنک مجھے احمد کو بتا دینا چاہئے کہ اس کا بیس فیصد شیئر پارٹنر اس کی کمپنی پر قبضہ کرنے کا سوچ رہا ہے۔ سوچ نہیں رہا جانی! ریاضن کو دیکھتے ۶۴ فیصد ارتی سا مسکراایا۔

میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں اس کمپنی کا نام بھی بدلتے

والا ہوں۔ خانزادہ انڈسٹریز کو ہٹا کر میں ”ڈبل ایچ اے انڈسٹریز“ رکھوں گا۔ یعنی کہ ”حمزہ حیدر علی انڈسٹریز۔“ ریاض نے نائش سے اسے فخر سے گردن تانے دیکھا۔

صرف حمزہ حیدر علی؟ یا ایم این اے کا بیٹا حمزہ حیدر علی؟“ یہ تھوڑا بڑا ہو جائے گا۔ اور ویسے میں نہ بھی لکھوں تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ کیونکہ اس ملک کے بچے بچے کو معلوم ہے کہ میں ایم این اے کا بیٹا حمزہ حیدر علی ہوں۔ اس کی تنی ہوئی گردن مزید اکٹھی تھی۔ اگر اس بار ظہور انکل الیکشن میں کامیاب نہ ہو سکے تو افف کیا دن ہو گا وہ۔ پھر تیرا نام صرف تین لفظوں پر ہی مشتمل رہ جائے گا۔ اس نے مذہ لیتے ہوئے کہا۔ تیرے منہ میں خاک کمینے چوہدری تجھے کیا معلوم کہ اپنے باپ کی کیمپین چلانے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں مجھے۔ میرا منہ نہ کھلوا۔ تیرے کارناموں کا سب علم ہے مجھے۔“ اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے وہ دوبدو بولا۔

تمہیں مذہ آتا ہے ناہ مجھے تنگ کرنے میں؟“ وہ تیز نظرؤں سے اسے دیکھتے ہوئے استفسار کر رہی تھی۔
ہاں بہت زیادہ۔“ نچلا لب دانتوں تلے دبائے اس نے اعتراض کیا۔

بس ٹھیک ہے۔ اب لاکھ مناؤ گے تو بھی نہیں مانوں گی میں
منہ پھلائے وہ اسے دھمکا رہی تھی۔

تمہیں ناراض کرنا اور منانا بہت آسان ہے یار۔ صبح سے دس
بار میں یہ کہ چکا ہوں۔ ہلکا سا اس کی جانب جھکتے ہوئے

وہ شوخی سے ہنستے ہوئے بولا۔

اب نہیں مانوں گی۔" پیچھے ہوئے ہوئے زد نور نے چہرے
کے تاثرات مزید سخت کر لئے۔

تبھی احمد کا فون بج اڑھا تھا۔ اس نے جیب سے نکال کر
اسکرین کو دیکھا جہاں حیدر کا نام جگمگا رہا تھا۔

اڑھاؤ ناں فون! تمہارا بیمارا دوست تمہیں یاد کر رہا ہے۔ ۵۹
چباتے ہوئے طنزیہ بولی۔

"بیلو السلام عليکم!" بھاری آواز میں اس نے مصنوعی
سنجدگی سے کال پک کرتے ہوئے سلام کیا۔

دیکھ خانزادہ! میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ دو دن کے اندر اندر
اپنی شکل دکھا دے ورنہ پھر تیری کمپنی کو بیچ کھاؤں گا
میں۔ آگے سے سخت بھٹائی ہوئی آواز سننے کو ملی
تھی۔

"پچھلے ایک ہفتے میں ہزار دفعہ فون کر کے، تو دو ہزار
دفعہ یہ دھمکی دے چکا ہے۔ میری طرف سے پوری اجازت
ہے۔ بیچ دے میری کمپنی"۔ وہ مطمئن سا بولا۔
"میں سچ میں بیچ دون گا۔"

ہاں سچ میں بیج دے۔"

او کے پھر۔ تیدی کمپنی میں خود کو بیج رہا ہوں۔ تیدے سی۔ ای۔ او" والے روم پر میدا پھلے ہی قبضہ تھا۔ اب اس کمپنی کا نام بھی چینج کر رہا ہوں۔"

"حیدر انڈسٹریز؟" احمد نے مسکراہٹ دباتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"نو! اُدبل ایچ اے انڈسٹریز۔" وہ خفا سا بولا۔

"اوہ اچھا! حمزہ حیدر علی انڈسٹریز۔" اس بار وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

"بس دوسروں کی محنت پر قبضہ کرنا سیکھا ہے تم نے خود میں تو اتنے گلّس میں نہیں۔ کھلے اسپیکر میں سے اس کی ساری باتیں سننے کے بعد زر نور جل کر بولی۔

"الله کرے تم اٹلی کی سنسان گلیوں میں کھو جاؤ نور

بانو۔" وہ بھی دوبدو بولا تو اسے مزید تپ چڑھی تھی۔

"اور اللہ کرے تمہاری شادی اس سال بھی نہ ہو۔ اس نے تذکرہ ہی حساب بے باک کیا تھا۔

"توبہ استغفار! ایسی کون بد دعا دیتا ہے نور بانو؟ پھلے ہی میری شادی پر جانے کس نے تعویز کروا دیے ہیں۔ جو ہو کر ہی نہیں دے دیں ہے۔" وہ روہانسا ہو چکا تھا۔

"یہ تعویز کا نہیں تمہارے اپنے اعمال کا قصور ہے۔ اس نے سر جھٹکا۔

"میں تو اپنے اعمال ٹھیک نہیں کرنے والا اور اگر تم دونوں دو
دن کے اندر پاکستان نہ پہنچے تو یاد رکھنا، پھر میں وہاں آ کر
تمہارے شوہر کو اغوا کر کے لے جاؤں گا۔ غصب خدا کا! تم
تو قبضہ ہی کر کے بیٹھ گئی ہو ہمارے دوست پر۔
تمہارے دوست سے پہلے یہ میرا شوہر بھی ہے۔ تم لوگ
یہ بات کیوں بھول جاتے ہو؟" اس کا پارہ بڑھنے لگا تھا۔
اس سے پہلے وہ مزید تیش میں آتی۔ احمد نے جلدی
سے حیدر کو یقین دھانی کروانے اور کچھ ہدایتیں دینے کے
بعد فون بند کر دیا تھا۔

کوچھ میں رات کافی بیت چکی تھی لیکن روشنیوں کے
اس شہد میں رونقیں اب بھی عدوخ پر تھیں۔ دو ہائیکوں پر
سوار چار نفوس میں روڈ سے آئے کے بجائے جلدی کے چکد
میں کچھ کے راستے سے اپنی بائیکس دوڑاتے ہوئے
دکھائی دیئے تھے۔ جو کہ قدرے سنسان اور غیر آباد سا
تھا۔

تبھی تھوڑی ہی دور کوئی ضعیف سا شخص کھڑا نظر آیا۔
جو انہیں رکنے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا۔
ایک بائیک تو اسے نظر انداز کرتی آگے بڑھ گئی تھی جب
کہ پیچھے آئے والوں نے اس شخص کے نزدیک اپنی بائیک
روک دی تھی۔

خیدیت بابا جی؟ رات کے اس پھر ادھر کیا کر رہے ہیں
آپ؟" اس نے ہیلمٹ اتارنے کے بعد فکر مندی سے پوچھا۔
تم جیسے بے وقوفون کو لوٹنے کے لئے - نیچے اتر بائیک
سے " - دوسرا ہی لئے وہ شخص چادر اتار کر ایک طرف
پھینکتے ہوئے اپنی پستل نکال چکا تھا۔
وہ دونوں چونکے صندور تھے - لیکن خوف کے بجائے بیزاری
سی ان کے چہرے پر نظر آئی تھی - کیونکہ جہاں انہیں
پہنچنا تھا۔

وہ اس کے لیے بھلے ہی بہت لیٹ ہو چکے تھے - کداچی
کے شہریوں کو تو اچھی خاصی عادت ہو چکی تھی - اب
تو کسی موڑ پر ایسے چور ڈاکووں سے پالا پڑ بھی جائے تو
گھبرانے یا احتجاج کرنے کے بجائے خود ہی آرام سے اپنا
فون اور والٹ نکال کر انہیں پکڑا دیتے ہیں کہ بھائی سب
کچھ چھین لیا گاڑی بھی لے لی - کم از کم کدائی کے
پیسے ہی دے جاو - اگر کوئی رحم دل ہوتے تو تین، چار سو
روپے پھینک جاتے تھے - ورنہ تو پھر پیدل مارچ کرتے ہوئے
ہی گھر کی جانب جانا پڑتا تھا۔

چل اوئے موبائل نکال" پستل کا رخ ان کی طرف کئے، وہ
عجلت میں تیز لہجے میں بولا۔
دیکھ بھائی! تجھے یہ بائیک لینی ہے تو بے شک لے جا۔
ڈھائیں تین لاکھ سے کم کی نہیں ہے - تیدی زندگی سنور

جائے گی لیکن فون نہیں دوں گا میں - دونوں ہاتھ اٹھائے اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

فضول میں ہی لے جا؟ میرے ابا کی حق حلال کی کمائی سے خدیدی ہوئی ہائیک ہے - میں ایسے ہی اس کو لے جانے دوں؟

ریاض نے حیدر کو گھور کر کہا۔

بائیک بھی لوں گا اور تم دونوں کے موبائل بھی لوں گا۔ جلدی نکالو! پستل لہراتے ہوئے وہ دھمکاتے ہوئے بولا۔ بائیک کے ساتھ اس ریاض کو بھی لے جا۔ لیکن فون نہیں مانگنا مجھ سے۔

تیری تو۔ - حیدر کو ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ اس نے ایک ہوائی فائر کیا تھا۔

ریاض کو تو لگا تھا کہ شاید وہ کوئی نا تجربہ کار ہے۔ نقلی پستل سے انہیں ڈرا رہا ہو گا۔ لیکن اس کے کدخت چہرے اور پستل پر گرفت سے وہ بد گذ کوئی اندازی کھلاڑی نہیں لگ رہا تھا۔

آج تو بے شک گولی مار دے لیکن موبائل نہیں دوں گا۔ وہ بغیر خوفزدہ ہوئے اسی انداز میں بولا۔

ابے کیا ہیدرے جٹے ہوئے ہیں تیرے فون میں؟" وہ تنگ آچکا تھا اس کی ایک ہی تکدار سے۔

ہیدرے نہیں ہیں بھائی! نقلی آئی فون ہے۔ تیرے کسی کام

کا بھی نہیں ہے - ریاض نے بے زاری سے کہا۔

بھلے سے نقلی ہو یا اصلی، اپن کو تو ابھی کے ابھی چاہیے - اس نے پستل کی نال حیدر کے سینے پر رکھ دی تھی - ریاض کا چیرہ فق پڑا -

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے حیدر؟" دے اس منحوس کو وہ نقلی فون - اور دفع کر اس کو یہاں سے - " وہ دے دے غصے مے بولا -

گولی مار دے، فون نہیں دوں گا" - وہ تو جیسے اپنی بات پر اڑ گیا تھا -

"اوئے مار اس کو گولی - نہیں ختم ہوتے اس کے ڈرامے " -
ریاض نے بھی غصے سے کہا - جبھی آگے جانے والی باشیک دوبارہ ریورس ہو کر پیچھے آ رہی تھی -

"چپ کرو تم دونوں -" وہ انھیں گھوڑتے ہوئے ریاض کی باشیک میں لگی چابی نکال کر وہاں سے دوڑ لگا چکا تھا - زیادہ بندے اس کے قابوں میں نہیں آسکتے تھے
"کیا ہوا ہے ؟ تم دونوں ٹھیک تو ہو ؟" حارت اور تیمور جلدی سے باشیک روک کر ان کے پاس آئے -

"میرا فون -- میرا فون -- پکڑ اس کو " - حیدر نیچے گرا ہوا تھا جبکہ ریاض باشیک سے ٹیک لگائے کھڑا اسے گھوڑ رہا تھا -
"تیرا فون لے گیا ؟" آدھی ادھوری بات سن کر ماتھے پر تیوریاں لئے وہ آستینیں چڑھاتے ہوئے اس چور کے پیچھے

بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

"اوئے تو ٹھیک تو ہے نا؟ گوئی وولی تو نہیں مار دی
تجھے؟" حارت اس پر جھکا پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔
"میں ٹھیک ہوں بھائی - اس کے ہاتھ کا سہارا لیتے ہوئے ۶۰
اٹھ کھڑا ہوا۔

جبکہ اس نے گدلن موڑ کر اپنے پیچھے اندھا دھند آتے اس
لڑکے کو دیکھا تو گھبڈاتے ہوئے چابی اس کی جانب اچھال
کر اور بھی تیز دوڑنے لگا تھا۔

"تجھے مشورہ کس احمق نے دیا تھا بائیک روکنے کا؟"
حارت نے اسے ڈپٹا۔

اس نے - حیدر نے فوراً سے اس کی جانب اشارہ کر دیا۔
اسی نے کہا تھا کہ بائیک روک دے شاید کوئی صدورت مند
ہے۔

"اور وہ صدورت مند تم دونوں کو ہی غریب کر کے چلا گیا۔
"تجھے نہیں صرف اسے - میدا فون تو بچ گیا۔ شکر اللہ
کا!" دونوں ہاتھ اٹھائے وہ تشکد سے بولا۔

"حیدر سوری یارا یہ چابی تو مل گئی لیکن فون نہیں لا سکا
میں - پتا نہیں کدھر غائب ہو گیا وہ" - وہ ہانپتا کانپتا وہاں آیا
تھا۔

کوئی بات نہیں جانی میدا فون مید سے پاس ۲۱ سے - ۶۰
صرف چابی ہی لے کر گیا تھا - اس کے اطمینان سے

کہنے پر تیمور چونکا۔

تو بیکار میں اس کے پیچے کیوں بھیجا مجھے؟ چابی تو دوسری بھی بن جاتی -

ابے اس نے مجھ پر پستل تانی تھی۔ مجھ پر -- حمذہ حیدر علی پر ایسے ہی جانے دیتا میں اسے "؟ وہ تو جانے کیا کیا کہہ رہا تھا -

لیکن تیمور ایک ہی بات پر اٹک گیا تھا -
پستل؟ اس کے پاس پستل تھی؟
ہاں اور وہ بھی اصلی -

اور تو نے مجھے اس کے پیچے بھیج دیا؟ اگر وہ مجھے گولی مار دیتا تو؟

یہ ادھر دس منٹ کی ڈرائیور پر ہی تو ہاسپتھل - ایمبولنس کو بلائے بغیر ہم تھجے وہاں آرام سے لے جاتے " -
مجھے لگا کہ اس کے پاس پستل نہیں ہو گی جبکہ وہ بھاگ گیا -

مرو تم دونوں ! چل حارت ہم نکلتے ہیں ادھر سے " - ریاض نے ان دونوں کو گھورتے ہوئے اس کو کہا -

جانے کتنے دنوں کے بعد گلی میں آج چاند لگا -

تم آئے تو آیا مجھے یاد گلی میں آج چاند نکلا --

تاریک رات میں ، سنسان پڑے میں روڈ کے ایک طرف گاڑی

کھٹی کئے، وہ اس سے ٹیک لگائے کھٹا رہا۔ گاڑی کے اسپیکر میں لگا گانا بھی اس سننا شے میں گونج رہا رہا۔ تبھی وہ دونوں بائیکیں آگے پیچھے وہاں آکر رکیں۔

کدھر مد گئے تھے؟" اشعد نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔ پونے گھنٹے سے وہ وہاں کھٹا ان کا انتظار کر رہا رہا۔ مرنے والے تھے۔ لیکن بیچ کد آگئے؟"۔ پیلمٹ اتارنے کے بعد حادث نے بالوں میں ہاتھ پھریدتے ہوئے اطمینان سے کہا میرا نیا نکور آئی فون بچ گیا"۔

شکر کد بچ گیا ورنہ آئی فون کے ساتھ تو بھی اوپر جاتا اور میں بھی"۔ ریاض نے دانت پیس کر کہا۔

ہوا کیا ہے؟ اشعد نے نام سمجھی سے پوچھا۔ پہلے اس کو تو بند کر۔ کون سا چاند نکلنے کی خوشی منا رہا ہے تو؟" نیمور نے بیزاری سے اس کی گاڑی میں بختے گانے کی طرف اشارہ کیا۔

اچھا اب بتاو کیا ہوا ہے؟ اس نے بند کر کے پوچھا۔

کچھ نہیں ہوا یار! میں روڈ کے بجائے ہم پیچھے کے راستے سے آ رہے تھے تو بس موبائل اسٹینیجر سے پالا پڑ گیا لیکن خیر بچت ہو گئی

خانزادو ولا اس وقت اندر ہیں میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن کچھ میں جلتی روشنیاں وہاں کسی کی موجودگی کا احساس دلا

رہی تھیں۔

"احمد تم کیوں پیتے ہو اتنی کافی؟" کاؤنٹر سے ٹیک لگائے سینے پر دونوں بازو باندھے، وہ نیند بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بیزاری سے بولی۔

"یہ میری ایک بہت بڑی عادت ہے اور بڑی عادتیں آسانی سے جان نہیں چھوڑتیں"۔ مصروف سے انداز میں کافی پھینٹے ہوئے اس نے مسکرا کر جواب دیا۔
لیکن میں چھڑوا دوں گی"۔

"اہا! شادی کو تین مہینے ہونے کو آئے ہیں، ابھی تک تو تم کامیاب نہیں ہوئیں"۔ کافی بنائے کے بعد مگ میں سے ایک گھونٹ لیتے ہوئے اب وہ فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

پینک پالازو اور لونگ شرٹ کے ساتھ بلیک ہی دوپٹہ گلے میں ڈالے، بالوں کا بے ترتیب سے جوڑا بنائے۔ اس حلیے میں بھی اس کے دل میں اند رہی تھی۔
"اب تم چیلینج نہیں کرو مجھے"۔

"دو مہینے دیتا ہوں تمہیں۔ میری یہ عادت چھڑوا دو تم"۔
ہاتھ میں پکڑے مگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ چھڑتے ہوئے بولا۔

اوکے ڈن! اب سے صرف میں تمہارے لیے کافی بنایا کروں گی اور میرے ہاتھ کے ذائقے کا تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ دو

سے تین دفعہ پینے کے بعد ہی تمہیں کافی سے اچھی
خاصی نقدت ہو جانی ہے۔"

"یہ ظلم مت کرنا نور بی بی!" احمد نے خفا سے انداز
میں کہا۔

"تم میرے ہاتھ کی بنائی کافی نہیں پی سکتے؟" اسے
تو صدمہ ہی لگا تھا۔

نہیں نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ قطعی لمجھے میں بولا۔
تم مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اس کا انداز ندوٹھا سا تھا۔
ابھی بھی کرتا ہوں لیکن اس کافی کا بھی اپنا ایک الگ
ہی مقام ہے میرے دل میں۔ تم وہ مت چھینو یار!" احمد
نے بے بسی سے کہا تھا۔ جبکہ میں گیٹ پورے زور و
شور سے بیچ اڑھا۔ اس توزٹے کی کسر رہ گئی تھی۔
"تم یہیں رکو۔ اسے تنبیہ کرتے ہوئے وہ باہر جانے لگا۔
"احمد مجھے ڈر لگ رہا ہے اکیلے مت جاو۔ پتا نہیں کون ہو
گا اس وقت"۔ زرنور نے خوف کے زید اند اس کا بازو پکڑ لیا
تھا۔

کچھ نہیں ہو گا نور! تم بس یہاں سے باہر نہیں آنا۔ اسے
تسلى دے کر وہ جلدی سے کچن سے نکل کر تیز تیز قدم
اڑھاتا باہر پورٹیکو میں آیا۔

جب تک گارڈ بھی اس اچانک پڑی افتاد پر نیند سے بوکھلا
کر اڑھ بیٹھا تھا۔ اشارے سے اسے وہیں رکنے کا کہہ کر

احمد خود میں گیٹ تک پہنچا۔ جسے ابھی بھی اسپیڈ سے
پیٹا جا رہا تھا۔ آواز اتنی تیز تھی جیسے تین چار لوگ مل کر
ساتھ بجا رہے ہوں۔ جیسے ہی اس نے لاک پٹا کر دروازہ
کھولا سامنے کھٹے شخص نے بدھی سے احمد کو دیکھا۔
”بندہ مر جائے دروازہ بجا بجا کر لیکن تجھے کھولنے کی
 توفیق نہیں ہوتی۔ اسے گھور کر کہتے ہوئے وہ اندر آگیا
 تھا۔

او بابا! انسان لوگ کی طرح آیا کدو نا۔ ہم کو تو ڈرا ہی دیا
 تھا تم نے۔“
او بابا! میں حمزہ حیدر علی ہوں اور میں ایسے ہی آتا ہوں۔“
گارڈ کے ہی انداز میں کہتے ہوئے اس نے آخر میں کالر
 جھاڑے تھے۔

پانچ منٹ میں پوری کالونی میں طوفان مچا دیا۔ صبر نہیں
تم لوگوں میں ڈرا سا؟“

اتنے شور کی آواز پر دو تین قدیبی گھروں میں سے لوگ
دیکھنے کے لئے باہر نکل آئے تھے کہ کون سا زلزلہ آ گیا
۔

ان سے معذرت کرنے کے بعد احمد نے گیٹ بند کرنے ہوئے
ان پانچوں کو ڈپٹا۔ جو نک سک سے تیار جانے کس کے
ولیم سے ہو کد آئے تھے۔ یا پھر جانے والے تھے۔
شادی شدہ ہو گئے ہو لیکن عقد پھر بھی نہیں آئی تم

لوگوں میں" -

میدی نہیں ہوئی ابھی شادی" -

اور میدا صرف نکاح ہوا ہے" - ریاض اور حیدر نے فوراً ہی
احتجاج کیا تھا۔

تم لوگوں کو اتنی رات کو بھی چین نہیں ہے؟" دوپتھے اپنے
گرد لپیٹے وہ بھی ان کی آوازیں سن کر وہیں آگئی تھیں۔
مہمان آئے ہیں نور بانو چائے پانی کا پوچھنے کے بجائے
ایسے عزت کرو گئی اب؟"

میں باز آئیں تم جیسے مہمانوں سے تو" - اس نے فوراً
کانوں کو ہاتھ لگائے۔ حب تک وہ لوگ بھی لاونچ میں پہنچ
چکے تھے۔

ہم تمہارے شوہر کو لے کر جا رہے ہیں زد نور! کچھ گھنٹوں
تک چھوڑ جائیں گے" -

کس خوشی میں؟ اور کہاں لے کر جا رہے ہو؟ حارت کے
کھنے پر اس نے نا سمجھی سے تنک کر پوچھا۔
"سوری! وہ ہم تمہیں نہیں بتاسکتے۔"

کوئی ضرورت نہیں ہے۔ احمد کی کل ضروری میٹنگ ہے اور
وہ اپنی پر پریشان کر رہا ہے۔

ہمیں کچھ نہیں پتا۔ احمد ہمارے ساتھ ہی جائے گا" - تیمور
نے حتمی لہجے میں کہا۔

بات سنو بھن! یہ بے شک تمہارا شوہر ہے لیکن پہلے ہمارا

دوست ہے۔ اس لئے ہمارا حق زیادہ ہے اس پر۔ ریاض نے
رکھائی سے کہا۔

پھوہد لڑکی! کھانے میں کچھ بنایا بھی تھا یا کافی پر ہی
گزارا کر رہا ہے میدا غریب بھائی؟"

"میری بیوی بہت اچھی کٹاہی بناتی ہے حیدر" - حیدر
کے پوچھنے پر احمد فوراً بولا تھا۔

"واہ بھئی زد نور! تعریفیں ہو رہی ہیں میان جی کی طرف
سے" - ان کے ہوٹنگ کرنے پر وہ بھی جھینپ گئی تھی۔
"یہ اور بات ہے وہ بغیر نمک کے تھی۔ احمد کی اگلی بات
پر زنور نے ناراضنگی سے اسے دیکھا۔ (ہاں ٹھیک ہے اگر
وہ نمک ڈالنا بھول بھی گئی تھی تو ان لوگوں کو بتانے کی
کیا ضرورت تھی؟)

"لیکن پھر بھی بہت ٹیسٹی تھی۔ واقعی میں" - اس کے
خفا سے چھٹے کو دیکھتے ہوئے اس نے جلدی سے کہا۔
"بغیر نمک کی کٹاہی ٹیسٹی کب ہوتی ہے؟" تیمور نے آبرو
ٹھرا کر اسے دیکھا۔

"نمک کو چھوڑ یار! اگر یہ کچا گوشت بھی اس کے سامنے^{رکھ دیتی تو اس نے وہ بھی آرام سے کھا لینا تھا۔}
"چلو اب اتنی بھی پھوہد نہیں ہے۔ صرف نمک ہی تو نہیں
ڈالا تھا۔"

زر نور کٹاہی میں گوشت تو ڈالا تھا نا؟" وہ لوگ اب فارم

میں آچکے تھے۔

"بس چپ کرو تم لوگ اور یہ بتاؤ اس وقت کیوں میدے گرد پر
دھاوا بولا ہے؟ اس سے پہلے کہ زر نور کا صبیط جواب دیتا
، احمد نے انہیں خاموش کر دادیا تھا۔

"م تجھے لینے آئے تھے فوراً تیار ہو جا۔"

"میں اس وقت کھیں نہیں جا سکتا سوری" - اس نے فوراً
ہاتھ کھٹے کر دیئے۔

"یار تو بس جا کر تیار ہو۔ تیری بیوی سے اجازت ہے لے لیں
گے" - اشعد نے شدارت بھڑی سنجدگی سے کہا۔

احمد کھیں جائے گا۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

"جانے دو پیاری بہن! آتے ہوئے تمہارے لئے آئس کریم لے
کر آئیں گے" - تیمور نے پکارتے ہوئے کہا۔

نهیں کھائیں مجھے۔ رکھیں ہے میدے فریح میں" - اس نے
نخوت سے جواب دیا۔ لیکن جب حیدر اور ریاضتی کو تیر کی
تیزی سے کچن کی جانب بھاگتے دیکھا تو یہ ساختہ خود
کو کوسا۔

"انتنی دید سے آئے بیٹھے تھے۔ پہلے نہیں بتا سکتی
تھیں کیا؟" دوسرا ہی لمحے وہ دونوں آئیس کریم کا پورا
پیک اور چمچ لے
کر دوبارہ وہاں آچکے تھے۔ پلیٹ، پیالی لئے بغیر اس میں
شدوع ہو گئے تھے۔

انھیں باتوں میں لگا دیکھ کر وہ پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔ اور پھر آدھے گھنٹے بعد ہی وہ سفید شرت پر براون جیکٹ پہنتا نیچے اتدا تھا۔

صرف دو گھنٹے میں واپس آجاوں گا" - اس نے زرنور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ندمی سے کہا -

ہم تین گھنٹے بعد خود ہی چھوڑ جائیں گے -

دو گھنٹے بعد یہ مجھے یہاں نظر آنا چاہئے۔ اشعد کے کہنے پر اس نے ضبط سے کہا -

تم ایک گھنٹے کے لئے سو جانا کیونکہ یہ تین گھنٹے بعد ہی نظر آئے گا" - ریاض نے آنسکدیم ختم کرتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا -

اتم لوگ بتا دو مجھے ، کہاں لے کر جا رہے ہو اس کو ؟"

ہمیں ایک لڑکی پسند آئی ہے اپنی بھاہی کے طور پر

لیکن لڑکے سارے بک ہو چکے ہیں تو اسی لئے سوچا احمد کا ہی دوسرا نکاح کروادیتے ہیں۔ بس اس لئے لے کر جا رہے ہیں - حیدر کا انداز لاپرواہ سا تھا۔

اوپاگل! تجھے منع کیا تھا ناہ یہ بات ابھی کسی کو نہیں بتانی - تیمور نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

ہائے! میدے منہ سے نکل گیا۔ سوری بھائیوں" -

اور ہاں نور بانو! ہم اس کا نکاح کروانے بلکل نہیں جا رہے۔ تھوڑی دید کے لئے لونگ ڈرائیو پر جا رہے ہیں۔ بس ابھی

واپس آجائیں گے"۔ دوسرے ہی لمحے وہ لاپرواہی سے بولا۔

احمد! زر نور نے شاکن نظروں سے اسے دیکھا۔
مذاق کد رے ہیں یار!

ہم سنجیدہ ہیں اور بلکل بھی مذاق نہیں کد رے۔

تم لوگ کسی دن مجھے گھرد سے نکلوادو گے"۔ فرنٹ سیٹ پر بینٹھنے کے بعد اس نے سیٹ بیلٹ لگایا۔ اشعر اس کے ساتھ ہی ڈرائیونگ سیٹ سنپھال چکا تھا۔ جبکہ وہ چاروں بائیکس پر سوار تھے۔

کوئی بات نہیں جانی ہمارے گھرد کے دروازے نیڈے لئے ہمیشہ کھلے ہیں۔" شعر نے ہنستے ہوئے گاڑی استارٹ کر دی تھی۔

وہ گھری نیند میں تھی جب مستقل بجتے فون پر اس کی آنکھ کھلی۔ موبائل اٹھا کہ اس نے نیند بھری آنکھوں سے اسکرین کو دیکھا، جہاں زرنور کی کافی ساری مسٹ کالز موجود تھیں۔

اللہ خید کرے!" اس نے فوراً سے اٹھتے ہوئے جلدی سے کال پیک کی۔ حارث بھی جانے کون سے ضروری کام کا کہ کد چار گھنٹے سے غائب تھا۔

”کیا ہوا ہے زر نور سب خیر تو ہے ناہ؟“ مناہل نے پریشانی سے پوچھا۔

”کوئی خیریت نہیں ہے۔ وہ لوگ احمد کو پتا نہیں کہاں لے کر چلے گئے ہیں۔ فکر کے ساتھ ساتھ اس کا پارہ بھی چڑھا ہوا تھا۔“

”تو اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے یار؟ تمہیں پتا تو ہے ان کا۔“ - مناہل نے پر سکون ہوتے ہوئے اسے تسلی دی

چاند کی روشنی نے ہر سو اپنا تسلط جمایا ہوا تھا۔ ساحلی پٹی کے ساتھ ایک ہی لائن میں کچھ اوپن ائیر ریستورنٹ بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس ہی اشعد نے گاڑی روکی تھی۔ وہ لوگ ان سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ کار سے باہر اتر کر وہ اطراف کا جائزہ لے رہا تھا، جب حیدر اس کے پاس آیا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھ رکھے تھے۔ احمد نے نامسمجھی سے اسے دیکھا۔ جس کے چہرے پر شدارتی سے مسکدابٹ موجود تھی۔ ”ہیپی بدرتھ ڈے ان ایڈوانس خانزادہ!“ دوسرا ہی لمحے اس نے پشت پر سے ہاتھ نکال کر اس میں پڑی چابی احمد کے سامنے لہدائی تھی۔

”یہ؟“ اس کے چہرے پر اب بھی نامسمجھی کے ناثرات

تبھی حارث اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے، اس طرف لے آیا
تھا جہاں سدھ سا کپڑا کسی چیز کو ڈھاپے ہوئے تھا۔

حیدانگی سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے وہ کپڑا ہٹا دیا تھا۔
جہاں نئے ماڈل کی چم چم کرتی Kawasaki ninja ہیوی
بائیک اسے خوشگوار سی ڈھیدروں حیدتوں میں مبتلا کر گئی
تھی۔ یہ بائیک تو وہ خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اسے
خبر نہیں تھی، یہی بائیک اسے بڑھتے گئے طور پر
اس کے دوستوں کی جانب سے ملے گی۔

ائی کانٹ بلیو ایٹ" ہینڈل پر ہاتھ پھیدتے ہوئے اس کے
چھپے پر الگ ہی خوشی اور چمک سی تھی۔

ایک رائیڈ تو بنتی ہے۔ ریاضن سے شدارت سے کہتے ہوئے
ہیلمٹ اس کی جانب بڑھایا۔

اور پھر تھوڑی ہی دید میں تین بائیکس ایک ساتھ کھڑی ریس
کے لئے تیار تھیں۔ احمد کے دائیں بائیں حیدر اور ریاض بھی
اپنی بائیکس پر سوار تھے۔ جبکہ اشقدر، حارث اور تیور کو
ہیوی بائیک کا اتنا کریز نہیں تھا۔ اس لئے وہ وہیں کھڑے
انہیں دیکھتے ہوئے انجوئے کر رہے تھے۔

خاموش اور تاریک فضنا میں ان کی بائیکس ہوا سے باتیں کر
تیں، دھول اڑاتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتی جاری تھیں۔

صبح کے چار بج رہے تھے۔ جب اس نے لاونچ میں قدم رکھا۔ خانزادہ ولا کی ساری بتیاں بند تھیں سوائے لاونچ اور پورچ کے۔ وہ شاید اس کے انتظار میں وہیں صوفے پر سو گئی تھی۔ اب جو اس کی آمد سے ہوئی ہلچل کی آواز کانوں میں پڑی تو مندی مندی آنکھوں کو مسلطی اٹھ بیٹھی۔ وہ سنگ صوفے پر بیٹھا جھک کر جوتے کے تسمے کھول رہا تھا۔ جب اچانک ہی زرنور کی نظریں خود پر محسوس کر کے زرا سا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جو آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ احمد کو وجہ معلوم تھی۔ تبھی زیر لب مسکدا دیا۔

یہ-- یہ سب کیا ہے؟" احمد کا حلیہ اسے اتنا حیدان کر گیا تھا کہ وہ ٹھیک سے الفاظ بھی ادا نہ کر سکی۔ بدترہ ڈے گفت ہے میدے دوستوں کی طرف سے۔ "گردن پر کچھ محسوس ہوا تو اس نے جھک کر ٹیبل پر رکھے ٹشو باکس میں سے دو تین کھینچ کر اس سے گردن کو صاف کیا تھا۔ جہاں اس کے اندازے کے مطابق کیک کی باقیات ہی لگی تھیں۔ اس کی سالگردہ کی خوشی میں ان لوگوں نے کیک اور کولڈرنک سے اس کی اچھی خاصی تواضع کی تھی۔ احمد کو یہ نئے زمانے کی وجود میں آئی رسم سخت زہر لگتی تھی کہ ایسے رزق کی بے حد متی ہوتی تھی۔ اللہ کی نعمتوں کی ایسے بے قدری نہیں کہنی چاہئے۔

"یہ کون سا طریقہ ہے تحفہ دینے کا۔ حشد ہی بگاڑ دیا ہے سارا"۔ زرنور ناراضنگی سے کہتے ہوئے خود بھی ٹشو سے اس کی جیکٹ پر جا بجا لگے کیک کو صاف کر رہی تھی۔ "ویسے مجھے لگا تھا کہ تم خفا ہو جاوے گی کیونکہ ان لوگوں نے تم سے پہلے مجھے برتھڈے سر پرائنز دے دیا۔ وہ اپنے سامنے میز پر بیٹھی زرنور کو دیکھتے ہوئے چھپڑے کو بولا۔ ان لوگوں نے تو قسم کھا رکھی ہے میز پر کام کو بگاڑے کی اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ میز دوستوں کو برا بھلا نہیں بولا کدو"۔ خفگی سے کہنے کے بعد اس نے زد سر کو جنبش دی۔

واسیع رقبے پر پھیلا آفریدی والا پوری شان و شوکت سے کھڑا تھا۔ جس کے بھاری آبنوسی دروازے کے پار بڑے سے پارٹیکو میں کافی گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ اندر ہنسی عمارت سے شور و غل اور ہنسی کی آوازیں باہر تک سنائی دے رہی تھیں۔ جیسے کہ وہاں کوئی تقدیب اپنے عروج پر ہو۔ پر آمد کے دو استیپس چڑھنے کے بعد ہی اندر جانے کے لئے چھوٹا دروازہ تھا۔ جو سیدھا لاونچ میں کھلتا تھا۔ لاونچ سے ملحقہ ڈرائیور روم میں اس وقت کافی لوگ جمع تھے۔ کوئی دلچسپ سا موضوع زیر بحث تھا۔ جس پر سب ہی جوش و خروش سے تبصرے کر رہے تھے۔

جبکہ !! ان سب سے علیحدہ ایک طرف سنگل صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ اس خوبرو چہرے والے شخص نے سد اپنے ہاتھ میں پکڑے آئی فون پر جھکا رکھا تھا۔ جہاں وہ ویدیو کال پر موجود کسی سے محو گفتگو تھا۔

" یہ اچھا نہیں کہ رہے تو تم لوگ میرے ساتھ ۔ " اس کی بھناٹی ہوئی آواز پر حیدر بے ساختہ ہنسا تھا۔ اس کے کانوں میں ائیر فونز لگے تھے۔ جس کے باعث ریاض کی ساری جلی کٹیں سے صرف وہی فیض یاب ہو پا رہا تھا۔ دیکھ اب اس میں تو ہم میں سے کسی کی بھی غلطی نہیں ہے۔ تو نے خود کہا تھا کہ لاہور والی میٹنگ کے لئے تو خود جانا چاہتا ہے۔

تو مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے پیچھے تم لوگ ڈیٹ فیکس کرنے بیٹھ جاؤ گے۔"

" ڈیٹ فکسڈ ہو چکی ہے جانی! بائی دا وے مبارک ہو۔ فون کو چھرے کے قریب کٹے وہ قھوے کے گھونٹ بھرتے ہوئے مزید اسے جلا رہا تھا۔

جو لاہور میں بیٹھا سیخ پا ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اور کہ بھی کیا سکتا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ اس کے کہنے ۔

باوجود بھی حیدر نے اسے وہاں ہو رہی تقدیب کا ایک چھوٹا سا منظر بھی نہیں دکھایا تھا۔ سمارا ٹائم صرف خود کے

چھرے پر ہیں کیمڈے کو فوکس رکھا تھا۔

"کداچی پہنچتے ہی سب سے پہلے تیرا قتل کروں گا۔" بے

غیرت انسان! ہٹا لے اپنے منہ پر سے کیمدا۔"

ریاض کے جلے بھئے انداز سے دھمکیاں دینے پر وہ دل

کھوں کد ہنس رہا تھا۔ لیکن غلطی سے بھی بیک کیمڈے پر

اسے وہاں کا حال نہیں دکھا رہا تھا۔

"تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس ہوئی ہے آج اور تم ایسے

منہ بنا کد بیٹھی ہو۔ کانچ کی پلیٹ میں سے بدنی کا ٹکڑا

اڑھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے یشفہ نے اسے کھا تھا، جو

بیداری سی چھرے پر لئے کھٹکی کے پاس کھٹدی تھی۔

شادی میدی مرضی سے ۶۰ روپی ہوتی تو میں یقینا خوش

ہوتی آج۔" اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

"بس کد دو فاریہ! اب معاف کد بھی دو ریاض بھائی کو۔"

"مجھ سے معافی مانگتے تو کد بھی دیتی۔ اسکا انداز

بدستور سابقہ تھا۔

"اوہ! مطلب کہ ابھی تک تم دونوں کے بیچ سب پہلے جیسا

ہے۔" یشفہ نے تاسف سے سد ہلایا۔

"ہمیشہ ایسے ہی رہے گا۔ سد جھٹک کر وہ وہاں سے بٹ

گئی تھی۔ کیونکہ زر نور اور مناہد کے ساتھ انوشے اور لائبہ

بھی اس کے کمدے میں داخل ہوئی تھیں۔

”بہت مبارک ہو! وہ سب باری باری اسے گلے لگا کر مبارک
باد دے رہی تھیں۔ جو محظ مسکرا کر رہ گئی تھی۔

خانزادہ انڈسٹریز کی پر تعیش بلڈنگ میں اس وقت معمول کا
کام جاری تھا۔ ورکرڈ اپنے کاموں میں مشغول یہاں سے وہاں
جائے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے میں اسی ای او کی
ختنی والے روم میں وہ کوٹ اتارے پاور سیٹ پر بیٹھا
پیچھے کو ٹیک لگائے، کف موڑے، سیدھے ہاتھ کی انگلیوں
میں پین گھماتے ہوئے آبرو کو تدھھا کئے وہ سامنے بیٹھے
شخص کو دیکھ رہا تھا۔ جو گرما گدم پاستا سے بھدی پلیٹ
سے انصاف کرتے ہوئے لا پرواہی سے وہاں موجود تھا۔ ان
دونوں کے درمیان میں شیشے کی پٹی مید پر فائلز کا ڈھیر
لگا تھا۔ جو وہ ایک کے بعد ایک دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس
سے حساب بھی مانگتا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے تاثرات
سے صاف لگ رہا تھا کہ حیدر کی دی گئی ڈینیلز میں سے
ایک بھی پوائنٹ سے وہ سیٹس فائی نہیں تھا۔
تجھے معلوم ہے کہ یہاں پر جاپ کرنے والے ورکرڈ میں سے
کوئی ایک ایسا نہیں ہے جس نے تیری کمپلین نہ کی ہو۔
احمد کے سنجیدہ سے انداز پر اس نے ہلکے سے شانے
جھٹکے۔
”مجھے یہی امید نہیں۔“

حیدر، آئیم سیدئیس! مینیجر سے لے کد پیون تک کا کمپلین
لیٹڈ یہاں پڑا ہے۔ میں صرف ایک ہفتے کے لئے یہاں سے گیا
تھا۔ اور اتنے سے وقت میں تو نے خانزادو انڈسٹریز کا کباڑا
کرنے میں کوئی کسد نہیں چھوڑی۔"

کیا تو مجھے فائدہ کر رہا ہے؟ اس نے گلوگیر لہجے میں
پوچھا۔

اگر تو شکر ہولڈر نہ ہوتا تو پہلی فرصت میں تجھے
ٹرمینیٹ کر دیتا۔

تبھی حیات کچھ فائلز کا پلنڈہ سنبھالتی ہوئی ناک کد کے
اندر داخل ہوئی۔

سر آپ نے جو کام کہا تھا وہ ہو گیا ہے۔ اور ٹھیک ایک
گھنٹے بعد آپ کی میٹنگ ہے کمال اینڈ برادرز کے ساتھ۔
فائلز اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے یاد دہانی کدائی۔
”وہ میٹنگ کرنے حیدر سر جائیں گے۔ کافی کا مگ لبou سے
لگا کر وہ لاپرواہی سے بولا تو پاستا کھاتے حیدر کو اچانک
ہی کھانسی کا دورہ پڑا تھا۔

سوری! میں کوئی نہیں جانے والا کسی میٹنگ میں۔“ اس
نے فوراً ہی انکار کیا تھا۔

”حیدر“ احمد نے تنبیہ انداز میں اسے پکارا۔
یار یہ میٹنگ وغیرہ ہیڈل کرنا میدے بس کی بات نہیں ہے۔
تجھے معلوم تو ہے، مجھے اپنی زبان پر کوئی کنٹرول نہیں

ایوین فضول میں پھر کچھ بول دوں گا تو یہ ڈیل بھی ہاتھ سے جائے گی۔“

”ٹھیک ایک گھنٹے بعد ے میٹینگ - ڈیٹیلز حیات تمہیں بتا دے گی۔“ کوئی بھی اثر لیے بغیر اس نے اسی انداز میں کہا۔

تم ابھی تک ریڈی نہیں ہو ؟ یعنی ؟ شال کو کندھوں پر پھیلائے وہ اس کے روم میں داخل ہو کر حیدانگی سے بولی۔ میں نے دو گھنٹے پہلے کہا تھا شاپنگ پر جانا ے ریڈی رہنا۔ اور تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو۔ لائبہ نے اس کے ہاتھ سے ہک اچک لی تھی، جو وہ کب سے پڑھنے میں مگن تھی۔

میرا دل نہیں کر رہا جائے کا۔ ناراض ناراض سے تاثرات کے ساتھ اس نے جواب دیا۔

”کیوں دل نہیں کر رہا؟“

”بس نہیں کر رہا۔“

فاریہ! میں نوٹ کر رہی ہوں۔ جب سے ڈیٹ فکس ہوئی ے جب سے تمہارا موڈ آف ے۔ کیا ابھی تک پرانی باتوں کو دل سے لگا کد بیٹھی ہو؟“ لائبہ نے اسے شانوں سے تھام

کد اپنے سامنے کرتے ہوئے استفسار کیا۔

انھیں بھلایا جا سکتا ہے کیا بھا بھی؟ ”وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

شعر اور میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ وہ صرف ایک مس انڈرستینڈنگ تھی۔ رہی بات ریاض کی تو وہ صندی کا انسان ہے۔ کچھ چیزوں کے لیے تو ہمیشہ ہی کافی شدت پسند ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بار تو کسی لڑکی کے لئے اس نے اس طرح سے ری ایکٹ کیا ہے۔ ورنہ تو یونی لائف میں وہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اگر کوئی چیز تمہیں پریشان کر رہی ہے تو تم مجھ سے شئید کر سکتی ہو۔“ وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔

مجھے -- مجھے ان کی سمجھ نہیں آتی بھا بھی۔ اشعد بھائی سے لڑے کے بعد تو انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا مجھ سے شادی کرنے کے لئے۔ اور اب جبکہ نکاح ہو گیا ہے تو ایسے مجھے نظر انداز کرتے ہیں کہ جیسے جانتے ہی نہیں۔ مجھے ان کے پل پل بدلتے مذاج سے خوف آتا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ انھیں مجھ سے محبت ہے۔ وہ صرف اپنی صند میں یہ کہ رہے ہیں -- بھیگی آواز میں اپنے اندر کے ڈر کو اس کے سامنے رکھ رہی تھی۔ کیوں بدے اندیشوں کو دل میں جگہ دیتی ہو؟ وہ صندی صندور

۔ لیکن تم سے محبت بھی بہت کرتا ہے۔ اسے اپنے
ساتھ لگائے لائیں اسے محبت سے سمجھا رہی تھی۔

بلڈنگ کی کشادہ اور پر تعیش سی لابی کے ایک طرف بنے
کانٹر ٹیبل پر وہ کسی فائیل پر سائین کر رہا تھا۔ جب وہ
گلاس وال دکھیل کر وہ اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔ نیوی بلیو
تھدی پیسی کے کورٹ کو بازو پر ڈالے، ٹائی کی ناٹ
ڈھیلی کئے، بھوری آنکھوں کو گاگز سے ڈھکے، پیشانی
پر بکھرے بالوں کو اللہ ہاتھ سے سنوارتے ہوئے وہ پر
تمکنت سی چال چلتا ہوا اندر داخل ہو چکا تھا۔
جبکہ پین کو لبوں کے بیچ میں دبائے، کہنی کو ٹیبل پر ٹکا کر
وہ ستائش سے اسے وہاں آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

تجھے دیکھ کر تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کورین ڈرامے کی
شوٹنگ چل رہی ہے۔ حیدر نے اسے شدارت سے چھینڑا، جو
چشمہ ہٹہ کر اب پر سوچ نظرؤں سے اسے دیکھتے ہوئے
کف لنکس کھوں کر آستین اور پر چڑھا رہا تھا۔

اور کیا مجھے معلوم ہے کہ یہاں ابھی ایک ایکشن سین بھی
شوٹ ہونے والا ہے؟" کوٹ کو رسیپشن کی ڈسیک پر
رکھتے ہوئے اس انداز سنگین تھا۔

دیکھ ہم میچیور لڑکے ہیں۔ پرانی باتوں پر ایسے لڑائیں
جوہنگے کرتے ہوئے کیا ہم اچھے لگیں گے؟" حیدر کو یاد آ

چکا تھا کہ اسے کس بات کا غصہ چڑھا ہے۔ جبھی تو جلدی سے دونوں ہاتھوں کو سیز فائل کے سے انداز میں اڑھاتے ہوئے ساتھ ہی ایمیوشنل سے لہجے میں کہا۔

دونوں ریسیپشنسٹ کو اچھے سے اپنے مالکوں کی عادت و اطوار کا اندازہ تھا۔ جبھی سر جھکائے اپنے کاموں میں مشغول رہے تھے۔ میچیور کے بچے! اب تو بیچ کر دکھا مجھے سے۔" اس سے پہلے کہ ریاضن اس کی گردن دبوج لینا۔ وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا

چوتھی منزل پر موجود ورکرز آرام و سکون سے اپنے روز مرہ کے کام نبٹاتے نظر آ رہے تھے۔ جب ہی سیڑھیوں سے کوئی انہا دھند بھاگتے ہوئے اوپر آیا تھا۔
ہٹو سامنے سے!" راستے میں کھٹے ورکرز کو سائیڈ پر ہونے کے لئے چیختا ہوا وہ بھاگتے ہوئے وہاں سے گزرا تھا۔ اس کی آمد سے ایک ہٹبڑی سی وہاں مچی تھی۔ جیسے کوئی طوفان وہاں سے گزرا ہو۔ تمام ورکرز ضبط کے گھونٹ بھرتے ہوئے سر جھٹک کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہونے ہی لگے تھے کہ جب ہی ایک اور شخص بھی اس کے انداز میں بھاگتا ہوا اوپر پہنچا۔ وہ بھی گراؤنڈ فلور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ سانس بڑی طرح پھولा ہوا تھا۔
ریاضن سر پلیز اس طرف سے جائیں۔" نیچے گئے ہوئے

کاغذات کو سمیٹتے ہوئے اس نے التجائیہ انداز میں دھائی دی تھی۔ ان کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ان کے باس کے یہ دونوں شئید ہولڈز ہمیشہ ہی اپنی حدکتوں کی وجہ سے انہیں ضبط کے گھونٹ بھرنے پر مجبور کیا کرتے تھے۔ کون کی ریس سے لگ رہی ہے یہاں پر؟" وہ بے دھیانی میں انہا دھند بھاگ رہا تھا جب ہی ارمان کے روم سے کوئی اسی وقت نکلا تھا۔ اور بے دھیانی میں حیدر سے ٹکرا گیا تھا۔ حارث نے اپنا کندھا مسلتے ہوئے کداہ کر اس سے پوچھا۔ جو اس ٹکرانے کے بعد وہیں رک چکا تھا۔ اس کے پیچھے آتے ریاض نے فوراً ہی گددن سے پکڑ کر اسے قابو میں کیا تھا۔

کہیںے حارث! تجھے بھی اسی وقت ہی اینٹری مارنی تھی؟" ریاض کی گرفت میں مچلتے ہوئے وہ حارث پر ہی اللٹا۔ دیکھ ریاض! میدی کوئی غلطی نہیں ہے اس میں۔ تو ہمیشہ ہی میدے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ دوسرا ہی لے لمحے لہجے کو خوشامدی بناتے ہوئے اس نے کہا۔ غلطی کسی کی بھی ہو۔ لیکن آج تو ہی مرے گا میدے ہاتھوں۔" وہ اسے چھوڑنے پر بلکل آمادہ نہ تھا۔ کیا ہو رہا ہے یہاں؟"۔ احمد گلاس ڈور کھیل کر باہر آیا تو انہیں کمرے کے باہر ایسے کھٹے دیکھ کر حیدر سے بولا۔ "مجھے سمجھ نہیں آتا کہ ان دونوں کی موجودگی میں یہ

کمپنی اتنے آدم و سکون سے کیسے چل رہی ہے ابھی تک
! حارث نے ہنستے ہوئے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے احمد کو
کہا -

چل کہاں رہی ہے ؟ مشکل سے چلا رہا ہوں" - وہ سد جھٹک
کر بولا -

" یہ سخت نا انصافی ہے میرے ساتھ - میری غیر
موجودگی میں آخر میری شادی کی ڈیٹ کیسے فکس کی
جاسکتی ہے ؟ " ریاض اب ان دونوں سے شکوہ کر رہا تھا -
" یہ سوال تجھے اپنے سالے سے پوچھنا چاہئے اور جہاں
تک میرا اندازہ ہے تو وہ شادی بھی پشاور میں کرنے کا ارادہ
رکھتا ہے -

پشاور میں ؟ یہ فیصلہ کب ہوا ؟ مجھے کیوں نہیں بتایا گیا ؟ "
ریاض سے زیادہ تو حیدر کو شاک لگا تھا -

" تو واٹھ ہاؤس کا پریذیڈنٹ ہے جو تجھے ساری خبریں
پہلے ملنی چاہیے ؟ " ریاض نے اسے گھور کر سائڈ پر
کرتے ہوئے حارث کو پکڑا -

" اور تو پہلے مجھے یہ بتا کہ یہ افواہ ہے یا پکی خبر ؟ "
پکی خبر ہے جانی ! تیدی بارات لے کر ہم پشاور جائیں
گے - وہ بھی ٹرین میں خوار ہوتے ہوئے " - حارث نے اس
کے شانے کو تھپک کر کہا -

" ایسا کچھ نہیں ہونے والا میں بتا رہا ہوں تم لوگوں کو - اگر

کسی نے ایسا سوچا بھی تو اچھا نہیں ہو گا۔ ماتھے پر
تیوریاں لیے بولتے ہوئے، اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا پشاور
جانے کا۔

"یہ تو اشعد کا فیصلہ ہے۔ اب ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ ان
دونوں نے ہی مصنوعی افسوس سے کہا۔

"اتنا جو کچھ ہوا تھا، کیا وہ کم نہیں تھا؟ ایک شادی کدنی
تھی مجھے، صرف ایک شادی! اس اشعد کے بچے کو تو
پوچھتا ہوں میں اچھی طرح۔" بگٹے موڈ کے ساتھ وہ اپنے
روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔

کدھر؟ حیدر کو بھی آنکھ بچا کر کھسکتے دیکھ کر احمد نے
فوراً ہی اس کا بازو اپنی گرفت میں لیا تھا۔

میدی ہونے والی بیوی۔-- حیدر نے کھسیانی سی
مسکدابٹ کے ساتھ بولتے ہوئے فون کی اسکرین اس کے
سامنے کی۔

پاس ہی کافی شاپ میں ملنے کے لئے بلا رہی ہے۔
پندرہ منٹ ہیں میٹنگ شروع ہونے میں۔" احمد نے اسے یاد
دھانی کدوائی۔

پانچ منٹ میں آجائوں گا بس۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر یقین
سے کہتے ہوئے وہ فوراً ہی وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔

باہر کے مقابلے میں کافی شاپ کے اندر کا ماحول خاصہ پر

سکون تھا۔ جہاں کوئے کی میڈ پر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ آفس سے لنج بریک پر وہاں آیا تھا۔ اسی وجہ سے واٹ شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس تھا۔ کوٹ دوسرا سیٹ پر پڑا تھا۔ کافی کے بھاپ اڑاتے مگ کو ہاتھ میں پکڑے وہ سوالیہ نظرؤں سے اپنے سامنے ٹیبل پر پڑے اس چھوٹے سے باکس کو دیکھ رہا تھا، جو چند سیکنڈز پہلے ہی یشفہ نے اپنے بیگ سے نکال کر رکھا تھا۔

ایک ٹائپس پر واٹ ٹاپ پہنے، سیاہ دراز کدلی بالوں کے ساتھ وہ اس کے دل کے تار چھینڈ رہی تھی۔ لیکن گلابی چھدہ سپاٹ و سنجیدہ تھا۔ فقط ایک گھونٹ بھدنے کے بعد اس نے مگ کو ٹیبل پر رکھ کر وہ باکس اٹھا لیا تھا۔

گود میں دھرے یشفہ کے ہاتھوں میں اچانک ہی لرزش سی ہوئی تھی۔ لبou کو سختی سے بھینچے وہ خود پر ضبط کئے بیٹھی تھی۔

کیا یہ ہے؟ ”باکس میں پڑے اثید رنگ اور اور رنگ دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے پوچھا تمہاری امانت۔“

اگر یہ امانت ہے تو پھر اسے تو ساری زندگی صرف تمہارے پاس رہنا چاہئے تھا، واپس کیوں کر رہی ہو مجھے؟ کیونکہ میں یہ مزید اپنے پاس نہیں رکھا چاہتی۔ اس کا لہجہ ابھی بھی سپاٹ تھا۔

اچھا وہ کیوں؟

"آئی وانٹ بردیک اپ۔"

بردیک اپ؟ سیدنیسلی؟"

اب جبکہ ہماری شادی قدیب آگئی ہے تو تمہیں بردیک اپ کرنا ہے؟ اس کی آواز خیرتوں میں گھردی تھی -
ہاں کرنا ہے؟"

"کیوں؟ جہاں تک مجھے یاد ہے تو یہ ریلیشن ہم دونوں کی باہمی مرضی سے قائم ہوا تھا۔" پیچھے کو ٹیک لگا کہ بیٹھے ہوئے اس نے کہنی کو کہسی کی ہتھی پر ٹکا رکھا تھا۔ اور ہاتھ کی مٹھی بننا کر گال تلے رکھے تھے۔ اسے جانے کیوں اتنا یقین سا تھا کہ ابھی وہ ہنس پڑے گی اور کہے گی کہ "یار میں تو مذاق کر رہی تھی۔"

میری مرضی شامل نہیں تھی۔" وہ ابھی بھی اپنی بات پر ڈھنی ہوئی تھی۔

"مجھے یہ مذاق بلکل پسند نہیں آ رہا۔ ختم کرو اسے۔" اس بار اس کے انداز میں ناگواری کا تاثر ابھدا تھا۔
"میں کوئی مذاق نہیں کر رہی تمہارے ساتھ۔"
یشفہ! کلئیں بات کرو پلیز۔" حیدر نے لفظوں پر زور دیتے ہوئے ضبط سے کہا۔

"حید--- اصل میں۔۔۔ اصل میں مجھے کبھی تم سے محبت نہیں تھی۔ وہ تو بس میں نے تم سے بدلہ لینے کے

لیے کیا تھا۔

خشک ہوئے حلق کے ساتھ وہ دقت سے اپنی بات مکمل کرتی اسے چپ لگا گئی تھی۔

"اس سے زیادہ گھٹیا طریقہ نہیں سوجھا تمہیں بدلا لینے کا؟" چند لمحوں بعد اس کی تلخ آواز یشفہ کی سماعتوں میں پڑی۔

"حید--- منتشر ہوتی دھڑکنوں کو مشکل سے قابو کرتی، وہ اسے کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن دو درشتی سے اسے ٹوک گیا تھا۔"

جسٹ شٹ اپ! ایسا کیا کیا تھا میں نے تمہارے ساتھ جو اس طرح سے کیا تم نے؟" وہ اب بھی سے یقین تھا کہ یشفہ نے وہ باتیں اس سے کہی ہیں۔

اسے خود پر انہا کا غصہ آیا تھا، اس کے ہاتھوں اتنی آسانی سے بے وقوف بن جانے پر۔ کرسی دکھیل کر وہ خون چھا کائی نظدوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہاں رکا نہیں تھا۔ جبکہ وائدیٹ ہوتے فون کو اٹھا کر اس نے کال یس کی تھی۔

"ریاض بھائی! وہ میدی جان لے لے گا۔ فون کان سے لگائے وہ روہانی ہوئے ہوئے بولی۔

ساتھ ہی پریشانی سے ناخن چباتے ہوئے اس دروازے کو بھی دیکھ رہی تھی، جہاں وہ راستے میں پڑی کرسی کو

ٹھوکر مار کے نکلا تھا۔

"جی جی! میرے پاس ہی ہے۔ وہ لے کر نہیں گیا۔" مقابل کی بات سنتے ہوئے اس نے جلدی سے کہتے ہوئے مید پر پڑا وہ باکس اٹھا کر دوبارہ سے بیگ میں رکھ لیا تھا۔

"گدھ! اب ایک ہفتے تک اس کے سامنے نہ چانا بلکہ بھی۔" وہ مصروف سے انداز میں اسے ہدایتیں دے رہا تھا۔ یقیناً کوئی اور کام بھی ساتھ ہی کر رہا تھا۔

ٹائی کھینچ کر کاواچ پر پھینکنے کے بعد وہ اضطرابی حالت میں فون کان سے لگائے، یہاں سے وہاں ٹھلتے ہوئے دوسروی جانب موجود شخص سے بات کرنے میں مصروف تھا۔

میں مانتا ہوں کہ میری خواہش کے مطابق منگنی کے بجائے نکاح کیا گیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تو رخصتی کے لئے مجھے اب پشاور بلوائے۔" اس نے دو میل کو رک کر مقابل کی بات کو سنا تھا۔

دیکھ میں کچھ نہیں جانتا۔ تو انکل اور روحیل بھائیں کو خود منا لے ورنہ بلکل اچھا نہیں ہو گا۔ اس بار اس کا لہجہ سخت تھا۔

میں دھمکی نہیں دے رہا۔ بلکل سنجیدہ ہوں۔ میرا کوئی ارادہ نہیں ہارت کو پشاور لے جائے کا۔"

ایک منٹ ٹھہر زرا۔ نجھے کس نے کہا کہ میں تجھے پشاور

بلوا رہا ہوں؟" اشعد کی اسپیکر سے ابھری آواز پر ریاضن
نے الجھ گیا تھا۔

اس کا مطلب وہ لوگ مذاق کر رہے تھے میدے ساتھ ؟
شادی یہیں کراچی میں ہو گی نا؟" وہ بے تابی سے بولا
یہ سچ ہے کہ شادی پشاور میں نہیں ہو گی - "اشعد کی
بات پر اس واقعہ سکون سا اس کے اندر اترنا تھا۔

لیکن کراچی میں بھی نہیں ہو گی۔ اور اس بار وہ پھر ضبط
کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

تو کیا میدے ساتھ پہلیاں بجھوا رہا ہے؟ طریقے سے بتا
دے جو بھی بات ہے۔ ایک تو پہلے ہی دماغ کام نہیں کر رہا
تھا۔ اوپر سے اشعد کے ڈرامے۔

اصل میں شادی کوئٹہ میں ہونے والی ہے۔ بالآخر بلی
تھیلے سے باہر آہی گئی تھی۔
کوئٹہ میں؟" اس نے فون کی اسکرین کو ایسے دیکھا جیسے
اس کا دماغ چل گیا ہو۔

میں کراچی سے ہوں، وہ پشاور سے ہے اور شادی ہو گی
کوئٹہ میں؟ دماغ تو درست ہے تیرا؟ کراچی کے لوگ سات
ڈگری ہیں پاگل ہو جاتے ہیں اور تو چاہ رہا ہے کہ میں کوئٹہ
کی ٹھنڈی میں شادی کروں؟" ریاضن کا شدت سے دل چاہ رہا
تھا کہ کاش وہ اس کے سامنے ہوتا اور وہ کوئی بھاری چیز
الٹھا کر اس کے سر میں دے مارتا۔

تو بھاڑ میں جا مجھے کرنی ہی نہیں ہے شادی۔ ” آخری بات کہہ کر اس نے فون ہی بند کر کے کاوج پر پھینک دیا تھا

کیا کہہ رہا تھا؟ ” اشعد نے فون بند کیا تو لائیبہ نے شدارت سے پوچھا۔

اس نے کیا کہنا تھا بھلا۔ برس رہا تھا مجھ پر۔ ” وہ بھی مسکراتے ہوئے ان کے بیچ ہوئی گفتگو اسے بنانے لگا تھا۔ تم لوگ بہت تنگ کر رہے ہیں بے چارے کو۔ اس نے سچ میں کسی کو نہیں چھوڑتا۔ ”

یہ تو کچھ بھی نہیں لائیبہ ڈیڈ! جتنا اس چوردری کے بچے نے میدا بی پی ہائی کیے رکھا تھا نام، تو جتنا بھی میں اسے تنگ کرنے کے لیے کروں وہ کم ہی ہوگا۔
ویسے تمہیں ریاض کے حال پر رحم آ رہا ہے؟ ۲۴ جو کچھ حیدر کے ساتھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد تمہیں وہ زیادہ قابل رحم لگے گا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

اشعد پر اچھی طرح سے برسنے کے بعد وہ فریش ہو کر احمد کے روم میں چلا آیا تھا۔ جو تھوڑی دیر پہلے ہی وزٹ سے واپس آکر بیٹھا تھا۔ حارث بھی غالباً واپس جا چکا تھا۔ وہ روم میں داخل ہوا تو پہلی نظر کاوج پر نیم دراز، آنکھوں پر بازو رکھتے بیٹھے، اسی پر پڑی تھی۔ اس کی حالت پر وہ

زیر لب مسکراہٹ دبا گیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا یہ پیلین اتنا کارگر ثابت ہو گا۔

کیا ہوا؟ لہجے کو انجان بننا کر اس نے کچھ نا سمجھی سے اس کا بازو ہٹا کر پوچھا جو اسے گھورنے کے بعد رخ ہی موڑ گیا تھا۔

ایم این اے کے بیٹے کا شادی سے صرف کچھ دن پہلے بدیک اپ ہو گیا۔ یہ خبد تو نیوز چینل کی ہیڈ لائنز پر چلنی چاہئے۔

کیوں ریاض؟

بے شک! احمد کے سنجدگی سے کہنے پر اس نے فوراً ہی سد کو جنبش دیتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

کوئی اتنا بے وقوف کیسے ہو سکتا ہے آخر؟ تف بے مجھ پر۔ جو اس لڑکی کے دھوکے میں آگیا۔ ”سد کو ہاتھوں میں گدائے وہ اونچی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔

کوئی بات نہیں یار! ہم ڈھونڈ لیں گے تیرے لئے کوئی دوسری لڑکی۔ ریاض نے لا پرواہی سے کیا تو جواب میں ایک تیز نظر سے حیدر نے اس کو دیکھا تھا۔

کوئی ضرورت نہیں ہے کوئی دوسری، تیسرا لڑکی ڈھونڈنے کی۔ میدی شادی ہو گی تو صرف اس سے ہو گی بس بات ختم! حتمی انداز سے کہتے ہوئے وہ وہاں ایک لمحہ بھی مزید نہیں ٹھہردا تھا۔

ہو گئی اشعد سے بات "احمد کے پوچھنے پر اس نے اثبات
میں سد ہلایا۔

جب اس نے فاریہ سے میدا نکاح کروا دیا تھا ، تو یہ بات
میدے لئے حیدانگی کا سبب تھی کہ اس نے اتنی آسانی
سے کیسے مجھے معاف کر دیا۔ لیکن میں بھول رہا تھا کہ
وہ اشعد آفریدی ہے۔ مجھے تو وہی مثال یاد آتی ہے کہ
پورا دریا میدی ملکیت میں ہے لیکن پھر بھی پیاس بجهانے
کا اختیار نہیں۔ وہ انگلیوں سے پیشانی مسلطے ہوئے وہ خود
پر افسوس کرتے ہوئے بولا۔

کوئٹہ جانے میں کیا ایشو ہے ؟ احمد کے استفسار پر اس
نے نفی میں سد ہلایا۔

کوئٹہ جانے کی تک کیا بنتی ہے آخر؟ جب آرام و سکون
سے یہاں شادی ہو سکتی ہے تو پھر اتنی دور جانے کی
میدے نزدیک تو کوئی سیننس نہیں بنتی۔"

میدے خیال سے اشعد سے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ تفصیلی
بات کرنی چاہئے تھی تجھے۔"

میں نے آرام سے ہی بات کی تھی۔ ریاض نے جلدی سے
کہا تو اس نے ایسے ہاتھ جلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ
اجیسے کہ میں تجھے جانتے ہی نہیں۔"

بہرحال حارث اور تیمور کل شاپنگ کا کہہ رہے تھے تو میں ان
کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اس نے ٹیبل پر سے والٹ اور گاگلز

اڑھا کر کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے سرسری سا بتایا۔
شاپنگ سے یاد آیا۔ اگلے مہینے شادی ہے میدی۔ شاپنگ
کی ضرورت تو مجھے بھی ہے۔"

اوکے تو بھی چل ساتھ۔ اس نے اثبات میں سد ہلا کد کھا
تو وہ بھی جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ منظر تھا ہائپر استار مال کی فوٹ وئید شاپ کا!
گلاس وال کے پیچے سفید ٹائلز کے چم چم کتے فرش پر
ایک قطار میں ریکس لگی تھیں۔ جن پر مہنگے اور بدانڈ
جوتوں کی ایک وسیع رینج سجی تھی۔
ساتھ میں دو سے تین محملی کاوج بھی پڑے تھے۔ ان میں
سے ایک پر ریاض بیٹھا، اپنے سامنے سیلز بوائے اور جوتوں
کا ڈھیند جمع کیے ایک کے بعد پہن کر چیک کر رہا تھا۔ لیکن
ابھی تک اسے کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا۔
پورے دو گھنے ہو چکے ہیں۔ تجھے اللہ کا واسطہ ہے کچھ
تو پسند کر لے۔" حارث نے باقائدہ اس کے سامنے ہاتھ
جوار دے تھے۔
اشعد اور تیمور تو اکتا کر فوڈ کورٹ جا چکے تھے۔ جبکہ وہ
احمد اور حیدر کے ساتھ وہیں موجود تھا۔ یہ کوئی پانچویں
شاپ تھی۔

لیکن یہاں بھی اسے اپنے مطلب کا کچھ سمجھ نہیں آ رہا - وہ بے چارہ لڑکا بھی اسے جو تے دکھا کر بے حال ہو چکا تھا - تبھی ایک سیلز بوائے متفرک سا وہاں آیا -

ایکسکیوڈ میں سد! " اس کے انداز میں چکچاہٹ سی تھی - جی بھائی سب ٹھیک ہے؟ " حارت نے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا -

نهیں سد! مم -- میرا مطلب ہے کہ وہ جو آپ کے ساتھ ریڈ جیکٹ والے تھے -

حیدر کی بات کہ رہا ہے ، ہاں کیا ہوا اس کو؟ " ریاض نے ان دونوں کو بتانے کے ساتھ ہی اس سیلز بوائے سے استفسار کیا -

وہ وہاں پر شوز ٹدائے کر رہے تھے اور -- اور وہ بنا پیمنٹ کئے ہی پہن کر وہاں سے چلے گئے - ان کے خود کے شوز وہاں موجود ہیں - آپ دیکھ سکتے ہیں - اس نے بتانے کے ساتھ ہاتھ سے اشارہ بھی کیا ، جہاں تھوڑی دور رکھے کاچ کے پاس بلیک کلد کے جاگذ پڑے تھے - جس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ حیدر کے ہی تھے -

بس اسی چیز کی تو کمی رہ گئی تھی - ایم این اے کا بیٹا اب سد عام جو تے چدا کد بھاگا کرے گا - ریاض سد جھکتے ہوئے بڑبڑایا -

ارے آپ پریشان نہ ہوں بھائی! وہ بس ایسے ہی چیک کر

رہا ہو گا۔ ابھی آجائے گا تھوڑی دیر میں" - حارث نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔
لیکن سر یہ الاؤڈ نہیں ہے۔ ان کی وجہ سے مجھے فائد کر دیا گا۔ وہ گھبڑا ہٹ میں بولا۔

احمد اور ریاض دونوں اپنے فون سے اسے کاظمیکٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ حارث اسے اپنے ساتھ پڑھائے

مسلسل تسلیمان دے رہا تھا۔

بس کد دے چوہدری کتنے جوتے خریدے گا؟ شادی کے بعد یہ سب تیرے سد پر ہی پڑتے ہیں" -

اشعد اور تیمور کوئی آدھے گھنٹے بعد وہاں آئے تھے۔ لیکن ابھی تک انہیں وہیں جمے دیکھ تیمور بے زاری سے بولا۔ "خرید لئے ہیں یار، لیکن ابھی یہاں سے نہیں جا سکتے" -
کیوں کیا ہوا؟" ریاض کے مبھم جواب دینے پر اشعد ناممجھی سے بولا۔

"حیدر جانے کہاں چلا گیا ہے" -

"ہاں تو وہ آجائے گا جہاں بھی گیا ہے۔ یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کی کیا تک بنتی ہے؟" تیمور نے سوالیہ نظرؤں سے ان سب کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تبھی شاید احمد کا فون لگ چکا تھا۔

"کہاں پر ہے تو؟" سب کی نظر میں اس پر تھیں۔ جو فون

کان سے لگائے کھڑا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ چند سیکنڈز مزید بات کر کے اس نے فون بند کر دیا تھا۔ پھر کوٹ کی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس سیلز بواٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

اس کی طرف سے معذرت چاہتا ہوں۔ میں پیمنٹ کر دیتا ہوں"۔ اس کے شائستگی سے معذرت کرنے پر سیلز بواٹ نو ریاضن اس کی حرکت بتا چکا تھا۔

سر! اُس اور کے سر!" کہتے ہوئے، اس کا کریڈٹ کارڈ لے کر کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ جب تک اشعد اور تیمور کو بھی ریاضن اس کی حرکت بتا چکا تھا۔

"کہاں پر ہیں یہ صاحب؟" اشعد نے احمد سے اس کے متعلق پوچھا۔

"فوڈ کورٹ میں!"

بریک اپ کا صدمہ کچھ زیادہ ہی نہیں لگ گیا دماغ کو؟"

تیمور نے ایک تھیڈ اس کے سر کی پشت پر لگاتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔

پہلی بات تو یہ کہ میدا کوئی بریک اپ نہیں ہوا۔ "ادھ کھائے برگد کو پلیٹ میں رکھتے ہوئے اس نے ناگواری سے کہا۔ اور رئیلی؟ لیکن وہ سب کیا تھا جو یشفہ محتدمہ آپ سے فرمائیں؟

"دماغ خداب ہے اس کا۔" تلخی سے کہہ کر اس نے کولا کے کین کو لبوں سے لگا لیا تھا۔ جبکہ اس کا چھوٹا ہوا بردگر اب ریاض کے ہاتھ میں تھا۔

ویسے تو یہ انتہائی افسوس ناک خبر ہے لیکن مجھے پھر بھی جانے کیوں دکھ نہیں ہو رہا اس کے لئے۔ بردگر کھاتے ہوئے ریاض مصنوعی افسوس سے کہہ رہا تھا۔

مجھ پر اپنے جذبات صنائع کرنے کی تجھے ضرورت ہے بھی نہیں۔ تو بس کوئٹہ جانے کی تیاری کر۔ حیدر کو کہاں کسی کا حساب رکھنا آتا تھا۔

اس کی اس بات پر ریاض کو ڈائیک، کٹواہٹ میں بدلتا محسوس ہوا۔ شاپنگ کے دوران تو وہ اس بات کو فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔

اب یاد آیا تو ایک تیز نظر اشعد پر ڈالی۔ جو کین ہاتھ میں پکڑے تیمور سے محو گفتگو تھا۔ وہ دونوں فون پر کچھ پکچرز دیکھتے ہوئے تقدیر سے متعلق ڈریسنگ پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

شادی کی ڈیٹ بھی میری مرضی کے خلاف رکھی گئی تھی۔ اور اب یہ کوئٹہ کو فضول میں بیچ میں ڈال دیا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تو چاہتا کیا ہے مجھ سے؟" اس نے براہ راست پوچھا تو اشعد چونک کہ اس کی جانب متوجہ

تجھے یہی جگہ ملی تھی اس قسم کی باتوں کی؟" اس نے فوڈ کورٹ کے اطراف میں لوگوں کے ہجوم کو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا -

"جگہ کو چھوڑ تو میری بات کا جواب دے۔"

"کیا جواب دوں؟"

"مجھے یہیں شادی کرنی ہے۔" وہ ہڈ دھرمی سے بولا۔ "یہاں کہے گا؟ کیفے میں؟" حارث اور تیمور نے مصنوعی حیثت کا مظاہرہ کیا تو وہ جھینپ گیا۔

"میرا مطلب تھا کہ کداچی میں۔" دوسرا ہی لمحے وہ واپس اسی جون میں لوٹنے ہوئے بولا۔

نهیں ہو سکتی! اشعد کا اطمینان قابل دید تھا۔

"شادی ہوگی تو کوئٹہ میں ہی ہوگی۔ رخصتی کروانے کے لئے تجھے وہیں آنا پڑے گا۔"

"کوئٹہ تو بہت قریب ہے کداچی سے۔ تو سات سمندر پار کیوں نہیں بلوا لیتا؟" ریاض نے طنزیہ پوچھا تو اس نے با مشکل مسکراہٹ چھپائی۔

مشورہ اچھا ہے ویسے، غور کیا جا سکتا ہے اس پر۔

"اشعد کا سابقہ انداز اسے غصے کے گھونٹ پینے پر مجبور کر گیا تھا۔

"اگر وینیو ڈیسائید ہو گیا ہے تو کیا ہم باقی کی شاپنگ کر سکتے ہیں؟" تیمور نے بیزاری سے پوچھا۔

”بلکل! اور مجھے تو ابھی گدم کپڑے لینے پیس بہت سارے - کوئی کی ٹھنڈ تو خون بھی جھا دیتی ہے - اشعد کوئی موقع نہیں چھوڑ رہا تھا ریاض کو تپانے کے لئے۔ اس نے احتجاجی نظروں سے احمد کو دیکھا۔ جو ان کی گفتگو میں حصہ لینے کے بجائے حیدر کے دکھندرے سن رہا تھا۔

پس سس ہوٹل کی وسیع پارکنگ میں اس وقت اندر ونی عمارت سے نکلتے ہوئے وہ لوگ ایک دوسرے سے باتوں میں مشغول دکھائی دے رہے تھے۔ لائبہ اور اشعد نے پہلی اینیورسی کی خوشی میں ان سب کو وہاں مدعو کر رکھا تھا۔ منگنی والے دن جو حالات ہوئے تھے اس کے پیش نظر اشعد نے ان لڑکیوں کے لئے پہلے سے ہی ایک الگ ٹیبل ریزرو کروادی تھی۔

جس کی بدولت ان لوگوں نے بھی سکون سے ڈند کیا تھا۔ اور بعد میں اس کا اسپیشل شکر یہ بھی ادا کیا تھا۔

”فاریہ!“ وہ زرور سے باتوں میں مشغول تھی جب حیدر کے پکارنے پر چونک کد اس کی جانب متوجہ ہوئی۔“ اشعد بلا رہا ہے کب سے، جلدی جاؤ۔“ اس نے اتنے عجلت بھرے انداز میں کہا تھا کہ وہ جلدی سے اپنی دوستوں سے ملتے ہوئے اس گاڑی کی جانب بڑھ گئی

تھی، جو سامنے ہی کھڑی تھی۔ وہ گاڑی پہلے سے استوارٹ تھی۔ لیکن اشعد کی نہیں تھی
چلتیے بھائی! ” فرنٹ سیٹ کا ڈور کھول کر اندر بیٹھتے
ہی اس نے ڈرائیونگ پد موجود شخص کو دیکھے بنا کیا تھا۔
جبکہ بیک مرد میں دیکھ کر بال سنوارتے ہوئے اس کی انگلیاں
تھمی تھیں۔

”استغفر الله ا“ بلند آواز سے کی گئی اس کی بذبڑاہٹ پر
فاریہ نے بدی طرح چونک کر اسے دیکھا۔ پھر تو جیسے
اسے کدنٹ چھو گیا تھا۔
آپ؟ حیرت کی زیادتی کے باعث اس کے منہ سے الفاظ
ہی نہ نکل سکے۔

”جی میں! آپ کا شوہر نامدار! ” دانت پیستے ہوئے وہ
گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

کیا کیا تو نے؟ ” تیمور حیرت سے حیرر کو دیکھ کر پوچھ
بیٹھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اشعد ابھی تک ہوٹل کی
عمارت کے اندر موجود تھا۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ
سامنے کھڑی گاڑی کسی اور کی نہیں بلکہ ریاضن کی
تھی۔

وہ دونوں شرعی میان بیوی ہیں ایک دوسرا کے۔ کچھ ٹائم
ساتھ گزرا لیں گے تو کیا چلا جائے گا کسی کا؟ ہاتھ جھلا

کد بے پرواہی سے کہتے ہوئے اسے یقیناً اپنے کئے پر
کوئی شرمندگی نہیں تھی۔

کسی کا کچھ جائے نہ جائے لیکن تو صدور جان سے جائے
گا۔ منحوس آدمی!" تیمور نے اسے گھورتے ہوئے ساتھ ہی
پیچھے مدد کر داخلی دروازے کو بھی دیکھا تھا۔ جہاں
ایگڑٹ سے اشعد، والٹ جیکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے
باہر نکل رہا تھا۔

"اب اس کو کون سنبھالے گا؟" اس نے تلملا کر پوچھا۔

آپ ادھر؟ لیکن اشعد بھائی۔ حیدان، پریشان کے ساتھ
اب وہ فکر مند بھی تھی۔

کچھ دید کے لئے اشعد نامہ بند کر سکتی ہیں آپ؟" گئیر
چینچ کرتے ہوئے اس کا لہجہ ناچاہتے ہوئے طنز یہ ہو گیا تھا۔
فاریہ نے ایک لمحہ لیا تھا اس کی بات کو سمجھنے میں۔
دوسرے ہی لمحے اسکے تاثرات سخت ہوئے تھے۔
بھائی ہیں وہ میدے۔ دانت پیستے ہوئے وہ زور دے کر بولی۔
علم میں مجھے اچھی طرح سے لیکن کیا تمہیں یہ بتاۓ
کہ میں کون ہوں تمہارا؟" اس کا سابقہ انداز اسے چپ لگا
گیا تھا۔

چلیں لائیہ؟" مناہل اور انوشے سے محو گفتگو لائیہ کو اس

نے مخاطب کیا تھا۔

فاریہ کہاں ہے؟" اطراف میں نگاہ دوڑا کر اس کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہوئے اس نے اچانک ہی پوچھا۔
وہ حارث اور مناہل کے ساتھ گئی ہے۔ حیدر کے جھٹ سے کہنے پر اس نے استفہامیہ نظرؤں سے اسے دیکھنے کے بعد ساتھ ہی زرا سی گدجن موڑ کر اپنے پیچھے دیکھا تھا۔ جہاں حارث احمد کے ساتھ کھڑا کوئی بات کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یشفہ کے ساتھ گئی ہے۔" تیمور سے جلدی سے بات کو سن بھالا۔

لیکن کہاں گئی ہے؟" اشعد نے نا سمجھی سے پوچھا۔ ایسے ہی لونگ ڈرائیو پر نکلی ہیں۔ آجائیں گی کچھ دید تک"۔ حیدر خود کو انجان ظاہر کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

یہ کون سا وقت ہے لونگ ڈرائیو کا؟ اتنی رات ہو چکی ہے۔ وہ متفرک سا فون نکالے اب فاریہ کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ فاریہ کا فون میدے پاس ہے اشعد! اور تم پریشان مت ہو۔ یہیں تک گئی ہیں دونوں۔ آجائیں گی کچھ دید تک"۔ لائبہ نے اس کے بازو کو کھنی سے تھامتے ہوئے ندمی سے کہا۔ اسے مجھے بتا کر جانا چاہیے تھا نا!

ریاض چلا بھی گیا؟ بڑی بڑاتے ہوئے اس نے یہاں وہاں کا جائزہ لیا تو اسے ناموجود پا کر حیرت سے پوچھا۔

ہاں اس کے سد میں درد تھا تو وہ چلا گیا۔ تیمور اور حیدر
کامیابی سے اپنے ڈرامے کو جاری رکھے ہوئے تھے

کچھ ہی دید میں ایک سنسان روڈ کے سائیڈ پر اس نے گاڑی
روک دی تھی۔ اب وہ رخ موڑے براہ راست اس کی جانب
متوجہ تھا جو نچلا لب دانتوں تلے دبائے اپنے اضطراب کو
کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن ریاض جس طرح
سے اسے دیکھ رہا تھا، اسے لگ رہا تھا کہ بس ابھی وہ
جان سے جانے والی ہے۔

استینڈنگ پر کہنی ٹکا کہ ہاتھ میں سد گدائے وہ یک ٹک اس
سیاہ لباس والی لڑکی کو دیکھنے میں ایسے مگن تھا
جیسے اس کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام ہی نہ ہو کرنے
کے لئے۔

گاڑی میں پھیلی گھری خاموشی سے گھبدا کہ فاریہ نے
صرف ایک دفعہ نگاہ اڑھا کہ اسے دیکھنے کی جسارت کی
تھی۔ دوسرا ہی سینکڑ وہ نظریں جھکانے کے ساتھ رخ
بھی بدل گئی تھیں۔

"تم تو غالباً میری گستاخیوں پر مجھے سزا دینے کا ارادہ
رکھتی تھیں۔ لیکن وہ تو دور کی بات، تم تو نظریں ملانے
کی بھی بھت نہیں کر پا رہیں مجھ سے۔" "ال اس کے
گھمبیر و بھاری لہجے پر وہ اپنی سانسیں روک گئی تھی۔"

"پلیز گھر چلیں۔ آپ اس طرح سے لے آئیں ہیں۔ سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

کتنا اچھا ہو اگد تم ان سب میں مجھے بھی شامل کر کے میدا بھی تھوڑا خیال کر لو تو۔ اس کا لہجہ یاسیت بھدا تھا۔ ایسی بات نہیں ہے۔ وہ بامشکل لبوں کو جینیش دے پائی۔

"تو کیسی بات ہے؟" مقابل محو سوال تھا۔

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تمہارے نزدیک میدا اہمیت صفر سے بھی کم ہے؟"

"آپ خود سے ہی سارے اندازے لگائے بیٹھے ہیں۔ اب میں کیا کہہ سکتی ہوں؟" سر سے سرکتے آنچل کو ٹھیک کرتے ہوئے وہ فوراً بولی۔

"میدے لئے میدے اندازوں سے زیادہ تمہارے کمے گئے دو لفظ کافی معنی رکھتے ہیں۔ لیکن تم تو وہ بھی کہنے کی روادر نہیں لگتیں۔ اس کے گھمبید انداز پر بھی وہ خاموش ہی رہی تھی۔

نکاح کے دو مہینے بعد آج وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔ ورنہ تو کبھی کہیں پر اتفاقاً ملاقات ہو جانے پر بھی وہ اسے دیکھتا نہیں تھا۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ اس نے حیدر اور تیمور کو گفتگو کرتے ہوئے سن لیا تھا کہ۔

اگر کسی کو اپنے پیچھے پاگل کرنا ہو تو پانچ دن تک لگاتار اس شخص کے آگے پیچھے گھومو۔ اسے اس طرح سے

اپنی عادت ڈال دو کہ جب چھٹے دن آپ اسے نظر انداز کدو تو وہ بے چین ہو اٹھے - ساتویں دن بھی اسے نظر اٹھا کر مت دیکھو۔

آٹھویں دن بھی اسے ایسے نظر انداز کدو جیسے اس کے وجود ہی دنیا میں نہ ہو۔ نویں دن بھی انجان بن کے اس کے سامنے سے گزر جاؤ۔ اور ان نو دنوں کا جو آؤٹ پٹ دسویں دن نکلے گا نا، تو وہ شخص سر کے بل چل کے خود تمہارے پاس آئے گا۔ "اب جانے یہ حیدر کا ذاتی تجربہ تھا یا پہد اس نے کہیں سے سنی سنائی بات کھی تھی۔ لیکن، ریاض کے دماغ میں بھی جیسے یہ بیٹھ گئی تھی۔ ویسے تو ایک استوپید سا ہی آئیڈیا تھا لیکن جانے اس کے جی میں کیا آیا کہ اس نے بھی اس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے فارمہ کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی یہ ٹدک کرے گی یا نہیں۔ لیکن تین مہینے گزرنے کے بعد وہ بھی کسی حد تک اکتا چکا تھا۔ آخر کو جس چھٹے میں اس کی دنیا بستی تھی وہ کیسے اتنے دنوں تک اسے نظر انداز کر سکتا تھا بھلا؟ اور یہی دن تھا جب اس کی بس ہو چکی تھی۔

اشعد سے بات ہوئی تھی میری۔ کہہ رہا تھا کہ شادی کوئٹھے میں کرنے کا ارادہ رکھتی ہے تمہاری فیملی"۔ اس کی اگلی بات -

فاریہ کے ذہن پر وہ منظر تازہ ہوا تھا، جب وہ اشعد اور لائیبہ کے ساتھ اس وقت لاونچ میں ہی موجود تھی اور اشعد نے اس سے فون پر بات کد کے یہ سب کہا تھا۔

ویسے تم لوگوں کا سارا خاندان اور قبیلہ وغیرہ تو پشاور میں ہے، تو پھر یہ کوئٹہ کہاں سے بیچ میں آیا؟ اس کے دوستانہ سے انداز پر جانے کیوں اسے بھی ڈھارس سی ہوئی تھی۔ اتنے دنوں سے جو ایک دھڑکا سا اسے لگا تھا۔ اس کا خوف بھی دھیرے دھیرے زائل ہونے لگا تھا۔

اصل میں بھی جان کوئٹن سے ہیں اور بابا پشاور سے - اس لیے پھر ہمارا ننھیاں کوئٹہ میں ہے اور دھدیاں پشاور میں - ایسے تو کبھی کبھار پشاور جانا ہو جاتا تھا۔ لیکن کوئٹہ تو ہم بہت ہی کم گئے ہیں۔ روحیل بھائی اور بابا جان بھی اسی لیے وہاں شادی کا کہہ رہے تھے۔ نظریں جھکائے وہ سادگی سے کہتے ہوئے اپنی بات ختم کد چکی تھی۔ لیکن دوسری طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کھنک تھی اس کی آواز میں۔ کیا جادو بھرا لہجہ تھا اس کا۔

یہ پہلی بار تھا جو وہ اس پر غصہ کرنے کے بجائے، ڈر و خوف کے بغیر اس کے ساتھ بیٹھی اس سے بات کد رہی تھی۔ کاش کہ وہ گزرتی رات وہیں تھم جاتی۔ یا پھر وقت تھوڑا پیچھے چلا جاتا۔ جب وہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی۔

لیکن اس سے بمکلام صدور نہیں۔

ریاض کے لئے تو یہ بھی بہت سے بہت زیادہ ہی تھا۔

فاریہ نے کچھ حیدت سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

جو اس کی باتوں کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے

خاموش سا گاڑی استارٹ کر رہا تھا۔ اشعد کی زبانی ہی

اسے معلوم ہوا تھا کہ کوئٹہ والی بات پر کافی بدہم ہوا تھا

وہ۔ فاریہ کو یہی لگا کہ شاید ابھی بھی وہ اس بات پر خفا

ہو گیا ہے۔

لیکن ریاض کے دل کی کیفیت سے صرف وہی باخبر تھا

مجھ سے مت پوچھ میدے محبوب کی سادگی کا انداز۔۔۔

نگاہیں بھی مجھ پر تھیں، پرده بھی مجھ سے تھا۔۔۔

تھوڑی ہی دید میں اس نے وہاں گاڑی روکی تھی جہاں

پہلے سے ایک ہونڈا سوک کھٹدی تھی۔

"ریاض بھائی! اتنی دید کر دی؟ اشعد بھائی کی اتنی

کالذ آگئی ہیں۔ گاڑی سے ٹیک لگائے انتظار میں کھٹدی

یشفہ نے عجلت سے کہا۔

"اسے پتا تو نہیں چلا؟"

"اے نہیں! میں نے ان کی کال اٹھائی ہی نہیں اور وہاں

حیدر نے سنبھال لیا ہو گا یقیناً۔"

امید تو مجھے بھی یہی ہے۔ سنبھول کر جانا۔ فاریہ کے

لئے اس کی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے وہ ساتھ ہی
یشفہ کو بھی تنبیہہ کر رہا تھا۔

بائیک کی نسبت مجھے کار انہی اچھی چلانی نہیں آتی۔
بٹ ڈونٹ وری آپ کی واٹف کو صحیح سلامت چھوڑ کر آؤں
گئی--

اگد ایسی بات ہے تو پھر میں خود ہی لے جاتا ہوں - میں
کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔

مذاق کد رہی ہوں ریاض بھائی! آپ ٹیشن نہ لیں"۔ بنتے
ہوئے کہہ کد اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبرھال لی تھی۔
تمہیں نہیں آتی ڈرائیونگ؟" وہ جو ان کی گفتگو سنتے ہوئے
خاموش سی کھڑی کن انکھیوں سے ریاض کو ہی دیکھ رہی
تھیں

اس کے اچانک سے پوچھنے پر گذبڑا گئی۔
نن---نہیں۔

"کبھی سیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی؟" ہڈی کی
جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا وہ اس کے چہرے کے نقوش کو دل
میں اتار رہا تھا۔ فاریہ نے اس بار پھر نفی میں سر پلایا تھا۔
"مجھے شوق ہے لیکن ڈر لگتا ہے کہ کہیں کسی کو ہٹ نہ
کر دوں"۔ انگلیاں مدوڑتے ہوئے وہ چکچا کر بولی۔
حیدت ہے مجھے - کسی کو ہٹ کر دینے کا خوف رکھتے
ہوئے بھی ، آپ اپنی اس حرکت سے باز نہیں آتیں۔

"سوری؟" اس کی زو معنی بات اس کے خاک پلے نہیں
پڑی تھی۔

"دھیان سے جانا۔ بات پلٹتے ہوئے وہ اسے بیٹھنے کا
اشارہ کرتے ہوئے فکر سے بولا۔

کیسی رہی ملاقات؟ ڈرائیونگ کرتی یشفہ نے شدارت سے
پوچھا۔

"اگر اشعد بھائی کو پتا چل گیا اس حرکت کا، معلوم ہے
کتنا برا لگے گا انہیں؟" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔
کم آن یار فاری! کس دنیا میں جی رہی ہو تو تم؟ آج کے زمانے
میں تو لوگ صرف ریلیشن شپ میں ہی اتنے آگے نکل
جاتے ہیں۔ پھر تمہارا تو ریاض بھائی کے ساتھ اتنا
اسٹریونگ ریلیشن ہے۔ جائز رشتہ ہے تم دونوں کے درمیان۔
پھر بھی مجھے
سمجھ نہیں آتا کہ تم انہیں وہ اسپیس نہیں دیتیں جو تمہیں
دینی چاہئے"۔ وہ دھیان سے ڈرائیونگ کرنے ہوئے کہہ رہی
تھی۔

میں اچھے سے جانتی ہوں آج کے زمانے اور اس کے
تقاضوں کو لیکن جو تربیت ہمارے خون میں شامل کی گئی
ہے، وہ ہمیں پاکستان سے باہر زندگی گزارنے کے باوجود
بھی اپنے قبیلے کی روایت اور اقتدار کو فراموش کرنے کی

دیتی۔ فاریہ کے لہجے کی سادگی اور انداز کی مضبوطی پر یشفہ نے برا سا منہ بنا کر ایک نظر اسے دیکھا تھا۔
تمم، نا یہ ناولذ زرا کم پڑھا کرو۔ مجھے تو صرف آدھی بات ہی سمجھ آتی ہے تمہاری۔ ایک پٹھان ہو کہ بھی اتنی گاڑھی اردو؟

یشفہ کی بات پر وہ مسکرا کر رہ گئی

سیٹ کی پشت پر سر لگائے وہ آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ جبکہ ڈائیونگ کرتا حیدر بار بار نظریں ونڈھے اسکرین سے ہٹا کر اس پر ڈال رہا تھا۔
کیا ہوا جانی؟ اس دس پندرہ منٹ کی ملاقات نے تو تجھے چپ ہی لگا دی۔ حیدر کا انداز شوخی بھرا تھا۔
مجھے نہیں معلوم کہ وہ ملاقات دس منٹ کی تھی یا بیس منٹ کی۔ گاڑی میں اس کی بھاری آواز گونجی۔
وہ مجھ سے کچھ انج کے فاصلے پر بیٹھی تھی۔ میں بغیر کسی رکاوٹ و ڈر کے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز کو سن رہا تھا۔

اس کی موجودگی کو محسوس کر پا رہا تھا۔ اس کی خوبیو۔ بند آنکھوں سے ہی سدگوشی کے سے انداز میں دھیمی آواز سے بولتا وہ وقتا روکا تھا۔

میں لمحوں کو شمار نہیں کر پا رہا تھا۔ مجھے لگا شاید وقت
بمارے درمیان ہی رک چکا ہے۔ لیکن وہ زدا سی دید جب وہ
میدے قریب تھی۔ مجھ سے بات کر رہی تھی۔ میدی
قریب موجودگی پر بھی خوفزدہ نہیں تھی۔ وہ پل جیسے
میدے ہوش اڑا گئے ہیں۔ میں چاہ کہ بھی خود کو اس
کیفیت سے نکال نہیں پا رہا۔ ”نومبر کی سرد رات میں گاڑی
میں پہلے پیٹر کی وجہ سے گرمائش تھی۔ جس میں
گونجتی ریاض کی پر تپش سی آواز سنتے ہوئے، وہ زید لب
مسکراتے ہوئے ڈرائیونگ پر اپنی توجہ
مدکور کیے ہوئے تھا۔

جبکہ باہر رات آہستہ آہستہ گزرتی اپنی تاریکی کو ہر سو
پھیلانے لگئی تھی۔

آج اسے شو روم نہیں جانا تھا۔ اس لیے بھی دید سے
اٹھنے اور ناشتہ کرنے کے بعد ابھی لاونچ میں آبیٹھا تھا۔
اس کی ساری توجہ میچ کی طرف تھی لیکن سینٹرل ٹیبل
پر پٹا وہ فون وقفے وقفے سے واٹریٹ ہوتا اس کی توجہ
اپنی سمت کھنچ رہا تھا۔

فاریہ تمہارا فون بج رہا ہے کب سے ”۔ کچن کی طرف رخ
کر کے اس نے آواز دینے کے بعد آگے جھک کر فون اٹھا لیا
تھا۔ کسی ان نون نمبر سے کال ابھی بھی آدھی تھی۔

روشن اسکرین پر چمکتے اس نمبر پر اشعد نے محض سرسری سی نگاہ ڈالی تھی۔ وہ نمبر تو اس کے حافظے میں محفوظ تھا۔ جب تک وہ بھی وہاں آچکی تھی۔ کس کا فون ہے؟ اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ یقیناً آج وہ پھر کیک بیک کر رہی تھی۔ جبھی تو اپنے اور ہاتھوں سمیت اس کے چہرے پر بھی میدہ لگا ہوا تھا۔ ”ڈونٹ نو! نمبر سیو نہیں ہے تمہارے کانٹیکٹس میں“۔ شانے اچکا کر کہتے ہوئے وہ دوبارہ میچ کی جانب متوجہ گیا تھا۔

رانگ نمبر ہوگا بھائی! آپ اڑھا لیں“۔ وہ چکچاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے نہیں کہتا کہ رانگ نمبر ہے۔ کال تو لیس کرو“۔ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

ارمان کے پر تعیش روم میں گلاس وال کے پاس کھٹے اس نے صبیط سے اسکرین کو دیکھنے کے بعد اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔ گیارہوں دفعہ یہ۔ ابھی بھی نہیں اڑھایا فون“۔ وہ سخت تپا ہوا تھا۔ ”مصدقہ ہو گی نا؟“ اس کے برعکس وہ پر سکون سا بولا۔ ”ٹائم میں وہ دونوں ارمان کے روم میں اس کے ساتھ ہی لنج

کیا کرتے تھے۔ لیکن آج اسے میٹنگ میں شرکت کرنی تھی تو صرف وہ دونوں ہی وہاں موجود تھے۔ سامنے شیشے کی میز پر رکھے کھانے سے انصاف کرتے ہوئے وہ گائے بگائے اسے بھی دیکھ لیتا تھا، جو مضطرب ساکب سے فون کے ساتھ ہی مصروف تھا۔

ہو سکتا ہے اسے تیدا نمبر معلوم ہو۔ اسی لیے تیدا فون نہیں اٹھا رہی۔ حیدر نے چاول کا چمچ منہ میں رکھتے ہوئے سرسری سا ہی کھا تھا، جس کے جواب میں اس کی ایک گھوری کا اسے سامنا کرنا پڑا تھا۔

”بیلو السلام علیکم!“ وہ فون سوئچ آف کرنے ہی لگا تھا جب اس کے کان سے لگے فون میں سے وہ آواز نکل کر اس کے دل کے تار چھیڑ گئی تھی۔ تنے تائیات فوراً ہی ڈھلیے پڑے تھے۔

”وعليکم السلام کیسی ہیں آپ؟ میں -- ریاضن بات کر رہا ہوں۔ اس شائستہ سی آواز پر فاریہ کے ہاتھ سے فون گرتے گرتے بچا تھا۔ نکاح ہو جانے کے بعد بھی آج پہلی بار اس نے فون کیا تھا۔ وہ بھی اشعد کی موجودگی میں؟ اس نے بے ساختہ اشعد کو دیکھا جو میچ دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہ نمبر دیکھ چکا تھا۔ اور یقیناً جان بھی چکا ہو گا۔

"اف اف" وہ ہدیہ اپٹ میں جلدی سے کال کاٹ گئی تھی۔

پہلے فون نہیں اڑھا رہی تھی اور اب میدا نام سن کر ہی کال کاٹ دی۔ اب اس کو میں کیا سمجھوں؟ فون کی تاریک اسکرین کو گھوڑتے ہوئے اس نے حیدر کو کہا۔

"شاید اشعد بیٹھا ہو گا قریب میں"۔

اشعد کیوں ہو گا گھرد پہ؟ وہ تو شوروم میں ہو گا نان اس وقت؟" اس نے نا سمجھی سے کہا۔

ہاں لیکن کل وہ حارت سے کہہ رہا تھا کہ آج وہ شوروم نہیں جائے گا۔

"یہ بات تو مجھے پہلے بتا نہیں سکتا تھا؟" ریاض کا دل چاہ رہا تھا کہ اس فلور سے اسے نیچے پھینک دے۔ تبھی ہاتھ میں پکارا اس کا فون رنگ ہوا تھا۔

"خود کال کر رہی ہے"۔ ان کمنگ کال کو دیکھنے کے بعد وہ چونکا، پھر خوشگوار سی حیرت سے اسے بتایا۔

شرمندگی اور حیا کے باعث وہ لب دانتوں تلے دبائے اپنے روم میں آئے کے بعد دروازہ لاک کر کے اسی سے پشت ٹکا کر کھٹی تھی۔

تم نے کال کیوں کاٹ دی تھی؟" اس کی آواز میں تعجب

"اشعد بھائی-- وہیں تھے - اور انہیں معلوم تھا کہ آپ کا فون ہے"- اس نے جھچھکتے ہوئے بتایا۔
اسے کیسے معلوم ہوا؟ کیا اسے الہام ہوا تھا؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"الہام نہیں! میں کچن میں تھیں، فون ان کے پاس ہی پڑا تھا تو انہوں نے دیکھ لیا نمبر "۔
اسے کون سا میرا نمبر یاد ہو گا - وہ لا پرواہی سے بولا۔
انہیں یاد ہے۔ بلکہ انہیں اپنے سب دوستوں کے نمبر یاد ہیں"۔

"تو تمہیں اتنا ڈرنے کیا صدورت ہے؟ میں کونسا تمہارا بواۓ فرینڈ ہوں؟ بیوی ہو تم میری۔ اتنا حق تو میں رکھتا ہوں کہ تمہیں کال کر سکوں۔ وہ کچھ ناراض ہوا۔
آپ نے فون کیوں کیا تھا؟ وہ سیدھا مدعے پر آئی۔
مما کہہ رہی تھیں کہ تمہیں ساتھ لے جا کر تمہاری پسند کا ویڈنگ ڈریس دلوادوں - لیکن معلوم ہے مجھے ، تم نے کبھی حامی نہیں بھدنی میرے ساتھ جانے کے لیے۔ سو ایسے ہی بتادو اپنی پسند - میں خود ہی بنیادوں گا۔
تفصیل سے کہنے کے بعد وہ خاموش ہوا تھا۔
"آنٹی کو جو پسند ہو، وہ لے میں"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔
"آنٹی کو نہیں پہنا لیکن"۔ وہ جتنا کد بولا۔

"مجھے ان کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں"۔
اور میدی؟" اس کا پر شوق لہجہ اس کی دل کی دھڑکن
بڑھا رہا تھا۔

"مدرسی سے آپ کی۔ آپ چاہیں تو اپنی مدرسی سے لے
لیں"۔

سچ میں لے لوں؟ بعد میں کوئی اعتراض تو نہیں کرو گی؟"
نہیں کروں گی۔ اللہ حافظ!" جلدی سے کہہ کر وہ فون کاٹ
گئی تھی۔

"کیا ہوا؟ کیا کہہ رہی تھی؟" حیدر نے اس کے چھدمے کے
رنگوں کو دیکھا تو سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں!" وہ مسکراتے ہوئے ٹال گیا تھا۔ پھر سیٹی پر
شوخ کی دھن بجا تا کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔

کچھ دید پہلے کے ریاض چوہدری اور ابھی کے ریاض
چوہدری میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

آفریدی والا اس وقت دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ لاونچ میں
جا بجا گیندے کے پھولوں اور لاثتوں سے سجاوٹ کی گئی
تھی۔

یلو کلد کی تھیم انتہائی دلکش لگ رہی تھی۔ لکڑی کے

منقوش جھولے پر بھی پولوں کی لڑیاں لپٹی ہوئی تھیں -
جہاں وہ زرد لباس میں سبز دوپٹہ سر پر لئے بیٹھی تھی -
گوری کلائیوں میں سبز رنگ کی کانچ کی چوڑیاں چھنک رہی
تھیں - سامنے ہی شیشے کی میز پر ابٹن کی تحال اور
مٹھائیاں پڑی تھیں -

پورے ہال کو کوئی خوبصورتی سے سجا�ا گیا تھا - جہاں اس
وقت رسم مايون جاری تھی - فرشتی نشست پر بھی
لڑکیاں ڈھوک سنبھالے تال سے تال ملا رہی تھیں -
ویسے تو شادی کے سارے فنگشن کوئٹہ میں ہی ہوئے
تھے - لیکن وہاں روانگی سے ایک دن پہلے لائیہ اور
نشاء (روحید کی والیف) کے اصرار پر آفریدی والا میں بھی
مايون کی تقدیر رکھی گئی تھی - اشعد کی ساری
فیملی نے تو کل کی فلاٹ سے ہی چلے جانا تھا
جبکہ ریاض کی فیملی مہندی سے دو دن پہلے جانے والے
تھے -

سفید کرتا شلوار میں کھنیوں سے بھی اوپر آستینیوں کو
چڑھائے وہ انتہائی ضبط کے ساتھ اس جھولے پر بیٹھا
تھا - جہاں کچھ دیر پہلے فاریہ کو بیٹھا کر رسم کی گئی
تھی - ایک تو پہلے ہی وہ کوئٹہ والی بات پر تباہوا تھا -
اوپر سے ایک پروجیکٹ کی کل اہم میٹنگ تھی - جس کے

لئے وہ اسٹاف کے ساتھ مدد کر تیاری کر رہا تھا۔ اس کے لامگے انکار کرنے اور غصہ دکھانے کے باوجود بھی حیدر اور تیمور اسے زبردستی آفس سے اٹھا کر آفریدی والا لے آئے تھے۔

کچھ دیر پہلے جہاں کافی سکون سے فاریہ کی ماں میوں کی رسم ادا کی گئی تھی۔ اب وہاں کا نقشہ ہی الٹا پڑا تھا۔ ریاض کے لباس پر ابھن کے ایسے نقش و نگار بنے تھے کہ اسے دیکھ کر کہیں سے نہیں پتہ لگتا تھا کہ پہلے اس کا رنگ کیا تھا۔ چھرہ، ہاتھ گردیاں سب ابھن میں بھیگے ہوئے تھے۔ آج صرف فاریہ کی رسم تھی۔ لیکن موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ساتھ ہی اس کی بھی نمائادی گئی تھی۔

بس کدو، بہت ہو گیا۔ ”ریاض کی حالت پر احمد کو ہی رحم آیا تھا۔ وہ لوگ ابھی بھی ابھن سے بھروسہ تھا۔ لیے اس کے سر پر کھڑے تھے۔ احمد کے سرزنش کرنے پر بد مذہ ہوئے تھے۔

ابھی سے کیسے بس کر دیں؟ بہت حساب نکلتے ہیں اس کی طرف ہمارے۔ ”حارت اور تیمور کو اسے چھوڑنے پر بلکل راضی نہیں تھے۔ ان کی شادیوں میں بھی تو ریاض نے جی بھر کر انہیں ستایا تھا۔

گلے میں پڑے پھولوں کے ہار اتار کر میز پر پڑختے ہوئے وہ

اللہ کھڈا ہوا تھا۔

اب زدا سا بھی ابٹن اور لگایا تو میں سچ بتا رہا ہوں، چھوڑوں
گا نہیں کسی کو۔" انھیں گھورتے ہوئے وہ سختی سے بولا
تھا۔

جن پر اثر تو کیا پڑنا تھا۔ اللہ ہنستے ہوئے مٹھائی کی
پلیٹین اٹھا کہ اس کے پیچھے پڑ چکے تھے۔

چوہدری تیدی شادی ہو رہی تھے۔ اتنی بڑی خوشی تھے۔
منہ تو میٹھا کد لے۔" اور ریاض کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ
سب چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ کچھ ہی دیر میں
اس کا ضبط جواب دے چکا تھا۔ سب سے ہے پہلے اس نے
دونوں ہاتھوں میں ڈھیر سارا ابٹن بھرا تھا۔ اور پھر جو اس
کے سامنے آتا گیا۔ اس ابٹن کا نشانہ بنتا گیا۔

احمد ہمیشہ کی طرح اس بار بھی رسم کے دوران قدیب
بھی نہیں بھٹکا تھا۔ وہ باہر ہی بیٹھا تھا۔ اس کی
ناراضگی کی وجہ سے کوئی ایسی حدکت کرنے کی پھر
کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ لیکن حارث کی ماں کی طرح
اس بار بھی وہ لوگ زرنور کے
کندھے پر ہی بندوق رکھ کر چلانے والے تھے۔

بات سنو ذرا تم!" وہ اپنی ہی دھن میں کچن کی جانب بڑھ
رہی تھی جب وہ اچانک سے راہ میں آ کر اس کا راستہ روک

گیا تھا۔

بولو کیا بات ہے؟" یشفہ کو فوراً ہی بڑیک اپ والا پرینک یاد آیا تھا۔ اس لیے گدجن اکٹا کر تنفر سے بولی۔

تم نے کہا تھا کہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تم؟
ہاں تو؟" اس کی زومعنی بات پر اس نے نا سمجھی سے دیکھا۔ شادی نہیں کرتی تو پھر میدی دی ہوئی رنگ ہاتھ میں پہن کر گھومنے کی کیا لوچک بنتی ہے؟ وہ اپنی جگہ پر سن ہو گئی تھی۔ بے ساختہ سر پر ہاتھ مارا۔ ایک تو اس کی نظریں بھی کتنی تیز تھیں۔

بھول گئی تھی اتارنا۔" گل بڑا کہ اس نے جو بہانہ سو جھا وہی کہہ دیا۔

حیدر نے کچھ کہنے کے بجائے آبرو اٹھا کر اور نچلا لب دانتوں تلے دبا کر اسے دیکھا۔ جس کے چہرے پر تذبذب کے رنگ چھائے ہوئے تھے۔

"کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو یشفہ ڈئیر؟" حیدر نے اسے مصنوعی گھوری سے نوازا تھا۔

چلو اب کہہ بھی دو کہ تم ڈرامہ کر رہی تھی۔
میں نے کوئی ڈرامہ نہیں کیا۔ مجھ سچ میں شادی نہیں کرنی تم سے۔"

ایسی بات ہے تو پھر واپس کرو میدی رنگ۔" اس نے اپنی بتھیلی اس کے سامنے پھیلائی۔

یہ تو اپنے پاس ہی رکھوں گی -- وہ فوراً سے انگوڑھی والے ہاتھ کو دوسرا ہاتھ میں دبا کر سینے سے لگا گئی تھی۔

حیدر اس کی عجلت پر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔ پہلے تو اسے یہی لگا تھا کہ شاید سچ میں یشفہ کا دماغ چل گیا ہے جو وہ رشتہ توڑنے کی بات کر رہی ہے۔ لیکن اب تو دل میں ڈینے ڈال کر بیٹھے سارے غم اور شکوک دور ہو چکے تھے۔ اسے اپنا آپ ایک دم ہی ہلکا پھلکا سا لگنے لگا تھا۔

جبکہ اس کے بعد عکس یشفہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی تھی کہ وہ چند دن بھی اپنی اداکاری اس کے سامنے جاری نہیں رکھ پائی تھی۔

نومبر کی سدد رات آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی۔ پورج کی ساری لائنس روشن تھیں۔ جس سے ملحقہ لان میں وہ اشعر اور روحیل کے ساتھ بیٹھا محو گفتگو تھا۔

"احمد تیری گاڑی لے جاؤ؟ تھوڑی دیر میں آ جاؤ گا بس۔

حیدر نے کافی خوشامدی سے انداز میں پوچھا تھا۔

نهیں! اس نے بغیر کسی مروٹ کے صاف انکار کیا تھا۔

اپنی من پسند چیزوں کے لئے وہ حد سے زیادہ پوزیسو تھا۔

انسان میں تھوڑا لحاظ تو ہونا چاہئے نا؟ میدے منہ پر ہی صاف منع کر دیا۔ منہ لٹکا کر واپس آنے ہوئے وہ جلے دل

کے پھر ہوئے پھر وہ رہا تھا۔

اب بے چارے ریاضتی اور حیدر کرتے بھی کیا۔ ان سفید،
سیاہ اور گرے کلڈ کی گاڑیوں کے ساتھ کھڑی اس ریڈ
اسپورٹ کار پر نظریں پھر پھل جاتی تھیں۔ لیکن اسے
ڈرائیو کرنے کی خواہش وہ دل میں ہی دبائے بیٹھے تھے۔
کیونکہ اس کار کا مالک بہت ہی سنگ دل واقع ہوا تھا۔ اتنی
میتوں کے بعد بھی ہاتھ میں چابی نہیں دیتا تھا۔ ہاں لیکن
اب اتنا بھی بدا نہیں تھا۔ بے شک چلانے نہیں دیتا تھا۔
لیکن ساتھ بٹھا کہ ایک چکد تو گھما ہی دیتا تھا۔

حارت اور تیمور ان دونوں کے تاثرات پر محفوظ ہو رہے تھے
وہ چاروں پورچ کی سینڈھیوں پر ہی بیٹھے تھے۔ رسم کے
بعد باہر ہی آگئے تھے۔ لڑکیوں کا تو رتھگے کا پلین تھا۔
کچھ بھی ہو جائے، آج تو میں اس کی محبوبہ کو لے کر ہی
جاؤں گا۔ حیدر وثوق سے کہتے ہوئے حارت کی طرف متوجہ
ہوا۔

"اور تو مجھے اس کی چابی لا کر دے گا۔"

تم دونوں کو نہیں دی تو مجھے کیسے دے گا آخر؟" اس
نے ہاتھ جھلایا۔

دے دے گا۔ بلکہ تجھے نہیں دے گا تو اور کس کو دے گا؟
آخر کو، تو ہی تو ایک اکیلی جان جگدے اس کی۔
ہاں لیکن مجھے معلوم کہ وہ مجھے بھی انکار کر دے گا۔

تمہیں پتا تو ہے وہ اپنی کار کے لیے کتنا ٹھیک ہے -

"نه اپنی کافی کے مگر میں سے دو گھونٹ لینے دیتا ہے -

نه اپنی بائیک چلانے دیتا ہے اور اس کار کی تو بات ہی

رہنے دو - اس کو تو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا - نہیں کیا

کدیں ہم ؟ مدد جائیں ؟ ہماری کوئی فیلینگ نہیں ہیں ؟ " 99

دونوں اتنے جذباتی ہو گئے تھے کہ حارت کو اڑھتے ہی بنی -

"ٹھیک ہے میں جاتا ہوں اس کے پاس لیکن پہلے ہی بتا رہا

ہوں - اس نے مجھے بھی صاف انکار ہی کرنا ہے -

"بڈی تو ایک بار جا تو صحیح" - پہد ان کے زبردستی

بھیجنے پر وہ ان تینوں کے پاس آ گیا تھا - جہاں کوئی

سیاسی موضوع زیر بحث تھا -

وہ کار کی چابی دینا احمد!" - ایک انگلی سے کان کی لو

مسئلتے ہوئے وہ خود کو لاپداہ سا ظاہر کر کے بولا - ساتھ

ہی کن انکھیوں سے اس کے چہرے کا بھی جائزہ لیا تھا -

جو روحیل اور اشعد کی جانب ہی متوجہ تھا - روحیل کی

کسی بات پر اپنا مؤقف رکھتے ہوئے، اپنی ہی گفتگو میں

مصروف اس نے جیکٹ کی جیب سے چابی نکال کر اسے

پکڑا دی تھی -

یہیں تک جا رہے ہیں، کچھ دید میں آ جائیں گے -- حارت کی

بات کو اس نے شاید دھیان سے سننا بھی نہیں تھا -

لیکن اثبات میں سر ہلا کر مثبت اشارہ صدور دے دیا تھا -

دیکھا میں نے کہا تھا ناہ اس کو انکار نہیں کدے گا وہ --
حارت کو فخر سے انگلی پر چابی گھماتے دیکھ حیدر نے
اسے گھوڑتے ہوئے کہا۔

مجھے تو لگتا ہے کہ حادث کی شکل میں اسے اپنی کوئی
بچھڑی ہوئی محبوبہ نظر آتی ہے۔ تبھی تو اسے اتنی
فوقیت دینا ہے -

"تم لوگوں نے جلد جلد کر یہیں پر جان دینی ہے یا پھر لانگ
ڈرائیو پر چل رہے ہو میدے ساتھ! حارت کی بات ختم
ہوتے ہیں حیدر نے اس کے ہاتھ سے چابی جھپٹ لی
تھی۔

ڈرائیو تو میں ہی کروں گا" -

نصف رات سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ٹھنڈا اور تارکی بھی
کداچی کے رونقون کو ماند کرنے میں کامیاب ہوتی نظر نہیں
آئی

تھی۔ حارت اور نیمور پیسنجد سیٹ پر تھے جب کہ ڈیول
پارٹنر کا فرنٹ سیٹس پر قبضہ تھا۔

اچھے سے آوارہ گردی کرنے اور سب کے مشترکہ فیصلے
پر ایک ڈھایے نما ہوٹل سے کڑک سی دودھ پتی پینے کے
بعد اب ان کی گاڑی دوبارہ آفریدی والا کی طرف گامزد
تھی۔

لیکن یہ تو ان میں سے کسی کے فرستوں کو بھی نہیں
معلوم تھا کہ آگے ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آئے والا ہے -

اگر واپس آفریدی ولا آؤ تو وہاں پر سجی محفوظ اسی شان
سے جاری تھی۔ زد نور کو تو رات وہیں رکنا تھا۔ لیکن اسے
واپس گھرد جانا تھا۔ اسی لیے وہ ان کے انتظار میں بیٹھا
تھا کہ کب وہ گاڑی واپس لائیں گے۔ اس کی کافی کا بھی
دوسرा دور شروع ہو چکا تھا۔

فاریہ سے ۶ رہی شادی کی سرشاری، احمد سے بھائے
سے پڑھائیں گئی گاڑی کی خوشی، کچھ دید پہلے کی
گئی چائے کی عیاشی گاڑی میں بجتا تیز میوزک، اندر ہیری
پرفسوں رات اپنے ۶ جیسے کچھ پاگل دوستوں کا ساتھ
یہ کچھ ایسی وجہات تھیں کہ جن کو ملا جلا کر ایک سدور
سا ریاض چوہدری کے سر پہ چڑھا تھا۔

جس کی وجہ سے تیز اسپیڈ میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے جب
ایک گاڑی پیچھے سے آکر اپنا راستہ بدلتے ہوئے کٹ مار کر
ان کی گاڑی کے سامنے آئی تو وہ اپنے حواس اور گاڑی،
دونوں کو فوری طور پر سنبل نہیں پایا تھا۔ نتیجتا ان کی
گاڑی آگے والی کار سے جاٹکدائی تھی۔
تیدا بیٹا غرق چوہدری! حیدر کا سر ڈیش بورڈ سے بڑی طرح

ٹکرایا تھا۔ گاڑی کے ٹائی زور سے چدچدائے تھے۔

شادی کی خوشی نے تجھے انہا کر دیا ہے۔ دیکھ کر نہیں چلائی جاتی گاڑی؟ حارث بھی اپنا سر پکڑے اس پر الٹا تھا۔ جبکہ تیمور آستین موڑ کر دروازہ کھولے باہر اتر چکا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اس گاڑی کو چلانے والے شخص کو کالد سے کھنچ کر باہر نکاتا وہ زن سے آگے بڑھ چکی تھی۔ جو بھی شخص تھا۔ لیکن کافی عجلت میں لگتا تھا۔ جبھی تو اس نے اوور ٹیک کیا تھا۔

بزدل ڈرپوک بے غیرت انسان! ”تیمور اسے وہیں کھڑا صلوواتیں سنا رہا تھا۔ ریاض سیٹ بیلٹ پٹا کر باہر نکلا تو حیدر اور حارث یک ٹک بونٹ کو دیکھے جا رہے تھے۔ تیمور اور ریاض نے بھی جب ان کی نظرؤں کے تعاقب میں دیکھا تو صحیح معنوں میں ہوش اٹھے تھے۔

تصادم کے باعث یقینا دونوں ہی گاڑیوں کو نقصان پہنچا تھا۔ لیکن جو ڈینٹ احمد کی گاڑی پر پڑے تھے، اسے دیکھ کر تو ان چاروں کو اپنی موت سر پر ناچلتی نظر آ رہی تھی۔ کہنے کو تو احمد ان کا جگدی یار تھا۔ لیکن جب وہ طیش میں ہوتا تھا تو اس کی ایک ہی جہاڑ پر سب تیر کی طرح سیدھے ہو جاتے تھے اور پھر یہاں تو معاملہ اس کی جان سے عزیز گاڑی کا تھا۔ یہاں تو انہیں خود پر فاتحہ پڑھ لینی چاہئے تھی۔

احمد تم ابھی تک یہیں ہو؟ مجھے لگا تم جا چکے ہو۔ زد نور نے اپنے گرد شمال لپیتے ہوئے حیدر سے پوچھا - اس نے اوپر کھڑکی سے ہی اسے نیچے کھڑا دیکھا تھا۔ جبھی نیچے آئی تھی -

لذکوں کا ویٹ کر رہا ہوں۔ میری گاڑی لے کر نکلے ہوئے ہیں کب سے"۔ احمد نے اس کی کلائی تھام کر اپنے برابر ہی چٹپر پر بٹھا دیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں تنہا تھے لان میں -

تمہاری گاڑی؟ اب تمہیں انتظار کرنے کے بجائے اس پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔ کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ وہ صیح سلامت اب واپس آئے گی۔ زرنور نے پنستے ہوئے کہا۔ وہ جواب میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ تمہیں بڑا گیٹ کھلا تھا اور وہ سرخ گاڑی اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر حارت موجود تھا۔

شکدے آج کی تاریخ میں پہنچ گئے۔ وہ ٹیبل پر سے جیکٹ اٹھ کر پہنٹے ہوئے بٹھایا۔ خلاف معمول کافی چپ سے تھے وہ چاروں۔

یہ کیا ہوا ہے؟ تھکن کے باعث احمد کا تو دھیان ہی نہیں گیا تھا اس طرف۔ لیکن جب زرنور نے حیدر سے بونٹ پر ہاتھ پھیلتے ہوئے کیا تو وہ بھی اس کی جانب متوجہ ہوا۔

زرا دید کے لئے اپنی زبان بند کر لیتیں تو کچھ چلا جانا تمہارا" - حیدر نے کھا جانے والے انداز میں اسے گھورا۔ یہ کیا ہے؟ اس نے اچانک ہی نظریں اٹھا کر ان چاروں کو دیکھا۔ جس کے ماتھے پر پڑتے بلou کو دیکھ کر ان کی جان ایسے ہی خشک ہوئی جا رہی تھی۔

کچھ نہیں! بس ویسے ہی ایک گاڑی سے ٹکدا گئی" - ریاض نے کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، تو باقی ہمینوں نے بھی اس کی پیدوی کی تھی۔

"ٹکدا گئی؟ اسے دیکھ کر تو لگتا ہے اچھا خاصہ تصادم ہوا ہے" - زور نور مصنوعی افسوس سے کہتی ان کی جان مزید سولی پر لٹکا رہی تھی۔

"نور بانوا تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔ آج خاموش ہو جاؤ - قسم کھاتا ہوں ساری زندگی تمہارے قدموں میں بیٹھ کر تمہارا احسان چکاتا رہوں گا۔ حیدر نظریوں میں ہی اسے چپ رہنے کی التجائیں کر رہا تھا۔ ورنہ تو بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح اس کا منہ بند کروادے۔

تجھے معلوم ہے اس سلیپنگ بیوٹی کا۔ نیند کے جھونکے گلے لگ رہے تھے۔ بس! مار دی گاڑی۔ ہمیں تو تو نے ڈرائیونگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ ورنہ تو خود جان سے چلے جاتے لیکن کبھی آگے والی گاڑی سے ٹکدانے نہیں دیتے۔ حیدر اور ریاض سارے راستے حارث کی منتیں تدلے

کرنے ہوئے آئے تھے کہ کسی طرح وہ الزام اپنے سر لے کر
انہیں بچالے۔

کیونکہ انہیں اچھے سے معلوم تھا کہ وہ کبھی حارث پر
غصہ نہیں کرے گا۔ ہاں لیکن انہیں ضرور اللہ لٹکا دے گا۔
لیکن آج تو حارث نے بھی دغادے دیا تھا۔ وہ کسی طور
بھی ان کا الزام اپنے سر لینے کو تیار نہیں تھا۔ اور جب
سیدھے طریقے وہ نہیں مانا تو بالآخر انہیں پھر دھمکیوں
سے ہی کام چلانا پڑا تھا کہ

"اگر اس نے ساری بات خود پر نہیں لی تو پھر اس کے
یونیورسٹی کے زمانے کے فرضی عشقیہ قصے وہ نمک مدرج
لگا کر مناہد کو اس کے خلاف بہڈ کا دین گے۔" مناہد اس
کی محبت تھی۔ اس کی سب سے بڑی طاقت اور اتنی
ہی بڑی کمزوری۔

صرف یہیں پر آکر وہ گھٹنے ٹیک گیا تھا۔ مجبوراً اسے یہ
کڑوا گھوٹ پی کہ ان دونوں کا کیا دھرا اپنے سر لینا ہی پڑا۔
"سوری یار احمد! وہ گائی اچانک سے اوور ٹیک کر گئی
تھی اس لیے بس یہ سب---" وہ شرمende سا کہہ رہا تھا
جب احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی
بات کاٹی تھی۔

"اُس اور کے!" ہو جاتا ہے۔ نارمل سے انداز میں کہتے ہوئے
وہ چابی لے کر ڈرائیونگ سیٹ کا ڈور کھول چکا تھا۔ اس کی

گاڑی میں گیٹ سے باہر جاتے ہیں ان لوگوں کا کب کا رکا
ہوا سانس بحال ہوا تھا۔

"نور بانو! میں بتا رہا ہوں۔ یہ حارث کا بچہ یقیناً پچھلے جنم
میں تمہارے میاں کی محبوبہ رہ چکا ہے۔ حیدر کی بے تکی
بات پر جہاں زر نور نے تیز نظر سے اسے دیکھا تھا وہیں
حارث نے ایک مکا اسے رسید کیا تھا۔

"بکواس ہی نہیں ختم ہوتی تیری"۔

قسمے! مجھے تو لگا تھا بس آج ختم ہیں ہم سب۔ لیکن
کمینے حارث! بچ گئے تیری وجہ سے"۔
"ویسے کس کی حرکت تھی یہ؟" زر نور نے مشکوک انداز
میں حیدر کو دیکھتے ہوئے ایسے پوچھا۔ جیسے اسے کامل
یقین ہو کہ حیدر کے علاوہ اور کسی کی یہ حرکت ہی نہیں
سکتی۔

"نور بانو! ایک دم غلط اندازہ ہے تمہارا۔ مجھ پر سے اپنی یہ
قاتل نظریں پٹا لوں۔ ورنہ یہیں جان سے چلا جاؤں گا"۔ حیدر
کے جذباتی لہجے پر زر نور نے ایک تھپٹ اس کے بازو پر مارا
تھا۔

میری غلطی ہے یار! میں ڈرائیو کر رہا تھا گاڑی۔ لیکن اللہ
کا واسطہ ہے، اس کے سامنے مت بول دینا۔ ورنہ میرے
ولیمے سے پہلے سوئم کا کھانا نصیب ہوگا تم لوگوں کو۔
احد ہوتی ہے ریاض! بولنے سے پہلے سوچ تو لیا کدو کم از

کم " - زرنور نے دہل کر کھا۔

اس کے پاس دماغ ہو گا تو سوچے گا ناں!"

صبح کے ساتھے آٹھ بجے ہی آفریدی ولا میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ساری رات جاگ کر پیکنگ کرنے کے بعد ابھی سب بھاگم بھاگم خود بھی تیار ہو رہے تھے۔ پورچ میں گاڑیاں بھی تیار کھٹی تھیں۔ فلاٹیٹ میں بس دو گھنٹے ہی رہ گئے تھے۔ تیمور اور حیدر کو سی آف کرنے جانا تھا اس لیے دونوں رات وہیں رکے تھے۔ ارادہ تو ریاض کا بھی تھا جائے کا لیکن احمد اسے زبردستی آفس لے گیا تھا۔

ایک طویل سفر کے بعد جہاز کوئٹہ انٹر نیشنل ائیر پورٹ پر لینڈ کر گیا تھا۔ اور پہر کچھ دید میں ہی سفری بیگ کو کندھے پر ڈالی، آنکھوں کو گاگلنے سے ڈھکے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے باہر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ چلتا ریاض فون پر محو گفتگو تھا۔ جو احمد سے کچھ فائٹر کی بات وغیرہ کر رہا تھا۔

جب وہ دونوں ائیر پورٹ کی عمارت سے باہر آئے تو اشعر خود انہیں رسیسو کرنے آیا ہوا تھا۔ تیمور اور حارت تو ایک دن پہلے ہی جا چکے تھے۔ ریاض اور حیدر آج مہندی والے دن

پہنچے تھے۔ جبکہ احمد کی فلاٹ رات کی تھی۔ وہ سب سے آخذ میں پہنچنے والا تھا۔
پخید را غلے!" اشعد نے گدم جوشی سے دونوں کو گلے لگایا تھا۔

تجھے میں نے کہا تھا کچھ کھانے کے لئے لے کر آنا۔ پھر
لایا کیوں نہیں؟" حیدر نے اسے گھوڑتے ہوئے پوچھا۔
صبر کر لے تھوڑا سا۔ حوصلی میں ایک پر تکلف سے کھانے
کا اہتمام ہو چکا ہے۔"

ایسی بات ہے تو پھر مزید ایک سیکنڈ بھی صنائع کیے بغیر
وہاں لے چل۔ بھوک سے جان نکل رہی ہے۔ قسم سے،
فلاٹیٹ میں بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔

گاڑی میں بیٹھو، بس ابھی پہنچ جائیں گے حوصلی۔" اشعد
نے پجیدو کی ڈرائیونگ سیٹ سنپھالی تو ریاض بھی فرنٹ
سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔

جبکہ حیدر ڈگی میں بیگز رکھنے کے بعد بیک سیٹ پر بیٹھ
چکا تھا۔

ابھی انہیں وہاں سے نکلے کچھ دید ہی گزری تھی کہ جب
ریاض کی بے ارادہ سی نگاہ کھڑی کے شیشے پر پڑی۔ اس
نے کچھ چونکے ہوئے کھڑکی سے سد بارہ نکال کر پیچھے
دیکھا۔ پھر جلدی سے اندر ہو کر اشعد کو دیکھا۔

"تیدی گاڑی میں کیا ہیدوئن موجود ہے؟

ہیروئن؟" اشعد نے نام سمجھی سے پوچھا۔

یا پھر کوئی اور نشہ آور ادویات وغیرہ جو اسمگلنگ کی ہو؟
فلحال تو تو مجھے نہیں میں لگ رہا ہے۔ پاگل ہو گیا ہے
کیا! میدی گاڑی میں اسمگلنگ کی ڈرگز کہاں سے آئیں گی?
وہ اسے گھور کر بولا۔

تو پھر یہ اتنی گاڑیاں ہمارے پیچھے کیوں آہیں ہیں؟ ریاض
کی بات پر اس نے بیک مدر میں سے دیکھا تھا
جو سفید رنگ کی بیسیں سے پچیس کی تعداد پر مشتمل
تھیں۔

ابے چوہدری!" اس نے تاسف سے نفی میں سدھلا�ا۔
" یہ گاڑیاں حویلی سے میدے ساتھ آئی تھیں۔ مجھے
رسیو کرنے۔ آخر کو تو داماڈ ہے۔ اب اتنا پروٹوکول تو تجھے
ملنا ہے تھا۔

وہ ہنستے ہوئے بولا تو ریاضی اور حیدر بے ساختہ ایک
دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

یہ گاڑیاں اس منحوس کے پروٹوکول کے لئے آئی ہیں؟ حیدر
تو تقریباً کھڑکی سے آدھا بادھی نکلا ہوا تھا۔ اشعد کے
پلیک پجیرو کے دائیں بائیں اور پیچھے چلتا وہ قافلہ واقعی
میں ایک شاہانہ پروٹوکول لگ رہا تھا۔

بلند و قامت پہاڑوں کے درمیان بنی اس وسیع و عریض

حویلی کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ حویلی کو اندر ورنی اور بیرونی طور پر برقی قمقوموں سے دلمہن کی طرح سجایا ہوا تھا۔ ساری خواتین زنان خانے میں تھیں۔ جبکہ مردوں کے لئے مہمان خانے میں انتظامات کیے گئے تھے۔ رات کو مہندی کی تقدیر تھی۔ جس کے لئے زور و شور سے تیاریوں کی جا رہی تھیں۔ جو کہ وہاں کی قدیم روایت کے مطابق مشترکہ طور پر کرنے کے بجائے الگ الگ ہوتی تھیں۔

اشعد کی گاڑی جب چوپٹ کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوئی تو وہاں موجود کافی سارے مدد ہاتھوں میں گلب کے ہار لئے ان کے انتظار میں کھٹے تھے۔ بچے سے لے کر بد ایک بوڑھے شخص نے بھی سفید لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

خود اشعد نے بھی سفید ہی کر تا شلوار پہنا ہوا تھا۔ جبکہ ریاض اور حیدر دو واحد انسان تھے وہاں جو جینز، شرٹ اور جیکٹ میں ملبوس تھے۔

سفید دستار والے وہ باریش سے بزرگ سب سے آگے کھٹے تھے۔ جو حویلی کے سب سے بڑے تھے۔ سب انھیں بی جان کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

یہ مید سے نانا جان ہیں۔ ”اشعد ان دونوں کو سرگوشی میں کہنے کے بعد آگے بڑھ کر ان کو بلوجھی زبان میں ریاض کی

طرف اشارہ کر کے کچھ بتا رہا تھا۔

خوش آمدید!“ وہاں کے لوگ پشتو اور بلوجھی کے ساتھ ساتھ اردو بھی ٹھیک ٹھاک بول لیا کرتے تھے۔

بی جان کو معلوم تھا کہ وہ کداچی کے شہدی پشتو اور بلوجھی دونوں سے نا واقف ہوں گے۔ اس لئے ان کے سلام کے جواب دینے کے بعد اردو میں ہی ان سے مخاطب ہوئے تھے۔

سب لوگ باری باری ریاض کے گلے میں پہلوں کے ہار ڈال رہے تھے، جب ہی ایک طرف کھٹدی نوجوان پارٹی نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ رائفلوں سے نکلتی تڑ تڑ گولیوں کا رخ آسمان کی جانب تھا۔

ماحول میں ایک دم اچھا خاصا ارتعاش سا پیدا ہوا تھا۔ حیدر اور ریاض نے تو بوکھلا کر اشعد کو دونوں بازو سے تھام لیا تھا۔ وہ سمجھے کہ شاید دوسرا قبیلے والوں نے وہاں دھاوا بول دیا ہے۔ ان پہاڑی علاقوں کے قبیلوں کی دشمنیوں وغیرہ کے قصے انہوں نے اشعد کی زبانی کافی سن رکھے تھے۔

بے وقوفون! تمہاری آمد کی خوشی میں تمہارا استقبال کر رہے ہیں۔ انسان بنو! ”اشعد نے بظاہر مسکراتے ہوئے انہیں گھر کا تھا۔

”ایسے کون استقبال کرتا ہے بھائی؟ ابھی مجھے دل کا

دورہ پڑ جانا۔ کانوں پر ہاتھ رکھے حیدر نے نا پسندیدگی سے کہا۔

"یہ تیمور سے ؟" ریاض کی سرگوشی نما بڑبڑا ہٹ پر حیدر نے اس کی نظرؤں کے تعاقب میں دیکھا۔ جہاں وہ ان لذکوں کے درمیان میں، وہ رائفل دونوں ہاتھوں میں کپڑے، دنیا جہاں سے بے خبر تڑا تڑ ہوائی فائرنگ کیے جا رہا تھا۔

"یہ لو تیمور بھائی!" لڑ کے بھی پرجوش سے میگزین بھر بھر کر اپنے تیمور بھائی کو پکڑائے جا رہے تھے۔

کچھ دید بعد وہ دونوں فریش ہونے کے بعد مهمان خانے کے ہال کمرے میں فرشی نشست پر بیٹھے تھے۔ بیچ میں دستر خوان پر گرم قہوہ کے ساتھ انواع و اقسام کا کھانا چنا ہوا تھا۔ جن میں زیادہ تر ڈشز گوشت کی بنی ہوئی تھیں۔ حارت اور تیمور بھی اب ان کے ساتھ موجود تھے۔ شام چھ بجے سے ہی محفل شروع ہو چکی تھی۔ حولی کے وسیع بدآمدے کو ہی ٹینٹ وغیرہ سے کور کر کے پنڈال کی شکل دے دی گئی تھی۔

روایت کے مطابق مردؤں اور خواتین کے لیے الگ الگ انتظامات تھے تو حولی کی اندر ٹونی عمارت میں خواتین بھی مہندی کی رسومات شروع کر چکی تھیں۔ جبکہ باہر مردؤں کی محفل نے الگ ہی سماع باندھا ہوا تھا۔ سارے

لڑکے ڈھول کی تھاپ اور گیتوں پر رواپتی رقص کر رہے۔

دن میں تو ٹھنڈ کا اتنا پتا نہیں چلا تھا۔ لیکن شام گزرتے ہی سردی کی شدت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہاں کے مقامی لوگوں کو تو وہاں کی ٹھنڈ کی عادت تھی۔ لیکن وہ بے چارے کدھی کے شہری کیا کرتے، جن کے دانت سردی سے بچاتے تھے۔

رات کے آٹھ بجے ہی موسم اتنا ٹھنڈا ہو چکا تھا کہ ریاض پنڈال کے باہر دیکتے الاؤ کے پاس آ گیا تھا۔ جہاں کچھ بزرگ پہلے سے دائیے کی صورت میں بیٹھے تھے۔ کچھ دیر پہلے وہ لوگ ایک شان و تفاخر سے اچ دھج کد پنڈال میں پہنچے تھے کہ آج تو بس کوئٹہ والوں پر دھاک بٹھا دیں گے۔ لیکن تھوڑی ہی دید گز ریاض کے سردی سے کانپتے ہوئے وہ لوگ باری کد کے ریاض کے پاس ہی چلے آئے تھے۔ جو پہلے تو سیاہ شلوار قمیض پر سیاہ ہی شال محلے میں ڈالے راجہ اندر بنا ہوا تھا اور اب یہ حال تھا کہ شال کو اس نے کھوکر اپنے گرد لپیٹ لیا تھا۔ ساتھ ہی ایک لڑکے سے مفلد چھین کر بھی آدھے چھرے پر نقاب کی طرح باندھا ہوا تھا۔

لیکن ٹھنڈ تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سب ریاض، ریاض کرتے اسے پورے ہال میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے کہ

ابھی استیج پر بیٹھے بیٹھے وہ کدھر غائب ہو گیا۔

اندر دفع ہو جا! جا کد رسم کد والے، ورنہ ان پتھانوں نے
بندوقین نکال کد کوئٹھے کے در و دیوار بلا دینے ہیں کہ ہمارا داماد
اغواہ ہو گیا۔

پہلی بات تو یہ کہ یہ پہچان نہیں بلکہ بلوچ ہیں - حیدر کی
تصحیح کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو آگ پر سینکتے ہوئے وہ
بامشکل بولا۔

ایک تو یہ بلوچ بھائیں پوری پوری کوشش کر رہے تھے کہ
اپنے کداجی سے آئے مہمانوں کی خاطر مدارت میں کوئی
کسر نہ چھوڑ رکھیں۔ اس کی ایک مثال یہ تھی کہ بڑے
بڑے ایکو میں بختے بلوچی گانے بند کد کے اب اردو گانے
لگا دیے گئے

"پتا نہیں کی کون سا نشہ کرتا ہے--"

"یار میدا ہد ایک سے وفا کرتا ہے--"

ایکو میں سے بختی اس چنگھاڑتی آواز پر سارے لڑکے پاگل
ہو کد بے وفا، بے وفا کے نعرے مارتے ہوئے جانے کون
سے دغاباز محبوب کی روح کو جھنچھوڑ رہے تھے۔

خود پر بے انتہا ضبط کرتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھا تھا
جس کے چہرے کا رنگ سرخ پڑا ہوا تھا۔ جو یقیناً ٹھہنڈ کی
وجہ سے تھا۔ آگ کے پاس سے اٹھنے کے لئے وہ بلکل

بھی راضی نہیں تھا۔ تیمور اور حارث اس کا حلیہ ٹھیک کرنے کے بعد زبردستی اسے اندر لے کر آئے تھے۔ جہاں اب نجائزے کون کون سے لوگ اس کے پاس آ کر خود ہی اپنا تعارف کرواتے ہوئے، اس کے ساتھ تصاویر بنوا رہے تھے۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

احمد کی فلاٹ بھی بس پہنچنے والی تھی۔ اسے بھی اشعر خود رسیو کرنے گیا ہوا تھا۔ فضاء میں ایک بار پھر گولیوں کی آواز شامل ہو چکی تھی۔ جہاں شاندار آتش بازی کا بھی مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ کچھ قوال بھی نشستیں سن بھالیں اپنی آواز کا جادو جگا رہے تھے۔ مہندی نائٹ سے زیادہ اب وہ ایک قوالی ٹائٹ لگ رہی تھی۔

گدم شال لپیٹے حیدر ایک انگلی گال تلے رکھے آنکھیں پھاڑے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو نوٹوں کی گڈیاں پکڑے ریاضن پر نچھاوار کر رہے تھے۔
سن!" اس نے برابر میں بیٹھے تیمور کو ٹھکہ مار کر متوجہ کیا۔ اتنا قیمتی اسلحہ، لاکھوں روپے کی آتشباری، اور اب یہ اتنے پیسے اس پر وار رہے ہیں۔ مجھے ایک بات بتا کیا یہ پاگل ہیں؟
یا پھر ان کا تعلق دہشت گردوں سے ہے؟"

"بکواس بند کر!" حیدر کے پد سوچ انداز سے کہنے پد تیمور نے اسے آنکھوں دکھائی تھیں کہ کھیں کوئی سن نہ لے۔ میری تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ ریاض پد تو ایسے واری صدقے جا رہے ہیں جیسے نجائزے کتنے عرصے کے بعد کوئی شکار ہاتھ لگا ہو۔ ریاض کی اتنی آٹھ گت ہوتی دیکھ کر وہ منہ بسور کد بڑیا۔

حوالی باہر سے جتنی خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ اندر سے اس سے زیادہ دلکش اور کشادہ تھی۔ جسے باہر کی طرح کافی خوبصورتی سے سجا�ا گیا تھا۔ داخلی دروازہ عبور کرتے ہی سامنے بٹا سا برآمدہ تھا۔ جہاں مہندی کی تقدیب اپنے عدوں پر تھی۔ نیچے زمین پر قالین اور گدے بچے ہوئے تھے۔ جہاں ساری خواتین اور لڑکیاں ڈھولک سنبرھائے گیت گا رہی تھیں۔

ہرے رنگ کے دیدہ زیب لباس میں پھولوں کے زیور پہنے وہ نظریں جھکائے وہاں بیٹھی تھی۔ دو لڑکیاں اس کے ہاتھوں پر مہندی سے نقش و نگار بنا رہی تھیں۔ قدیب ہی مہندی کی سجنی ہوئی تھالیں بھی پڑی تھیں۔ لائبہ تو حوالی کی بھو تھی،

اس لئے کامدار دوپٹے سے سد ڈھکے وہ ساری خواتین سے

خوش اسلوبی سے مل رہی تھی۔ جس کی دیکھا دیکھی
زرنور، مناہل اور انوشے نے بھی سد پر دوپٹے لے لیے
تھے۔

تم شادی شدہ ہو؟" ایک عورت نے حیرت سے زرنور کو دیکھ
کر پوچھا۔

"جی آئٹی!" اس نے مسکراتے ہوئے سد اثبات میں ہلا کیا
یہ دونوں بھی شادی شدہ ہیں۔ "لا آئنہ نے مناہل اور انوشے
کی طرف اشارہ کر کے کہا تو وہ اب حیرت سے ان کو
دیکھنے لگیں۔ باقی لوگ بھی ان کی جانب متوجہ ہو چکے
تھے۔

تم لوگ تو شادی شدہ کہیں سے نہیں لگتی ہو۔ ایک اور
عورت نے بھی ان تینوں کا سد سے پید تک جائزہ لیتے ہوئے
تنک کر کہا۔

"دیکھو زرا نہ ہاتھ میں چوڑیاں ہیں، نہ گلے میں کچھ پہنا ہوا
ہے، کان بھی خالی پڑے ہیں۔ ایسی ہوتی ہیں کیا شادی
شدہ عورتیں؟ وہ آپس میں ہی ان پر تبصرے کر رہی تھیں۔
انہوں نے مجھے عورت بولا" مناہل کو تو گہدا صدمہ ہی
پہنچا تھا۔

تقریب کا اختتام ہو چکا تھا۔ تھکن سے سب کا برا حال تھا۔
لیکن اشعد نے سب کو سونے سے منع کر دیا تھا۔ کیونکہ دو

پاس میں ہی کسی ڈھابے وغیرہ پر انہیں لے جا کر چائے پینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن ٹھنڈ کے باعث ان سب نے ہی صاف انکار کر دیا تھا۔

تو سامان منگوا لے۔ چائے ہم یہیں بنا لیں گے۔ حیدر کا مشورہ سب کو ہی پسند آیا تھا۔

پھر تھوڑی ہی دید میں ملازمین کے ہاتھوں اندر سے چائے کا سارا سامان منگوا لیا گیا تھا۔ اور اب سینہ یہ تھا کہ بدآمدے میں ایک طرف شیڈ کے نیچے لکڑیوں پر دودھ کی بڈی سی دیکھی چڑھائے، وہ سب بھی گول دائیں میں بیٹھے تھے۔ چائے بنائے کی زمہ داری انہوں نے احمد کو دی تھی۔ جس نے باخوشی قبول کر لی تھی۔

اگر کسی نے مجھے اس طرح سے حویلی میں گھومتے ہوئے دیکھ لیا ناں تو بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔ بڈی سی شال سے خود کو لپیٹے وہ ڈرے ہوئے انداز میں یشفہ سے بولی۔ جسے نیند نہیں آ رہی تھی تو وہ فاریہ کو بھی اٹھا کر اپنے ساتھ لیے، اب حویلی گھوم رہی تھی۔

ارے میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔ ”یشفہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے اپنے فون کو دیکھا تھا۔ جو نوٹیفیکیشن کی آواز سے گنگنایا تھا۔

اوہ! حیدر کی سینڈ کی گئی ویڈیو اور پکچر دیکھ کر اس نے

اشتیاق سے فاریہ کے سامنے اسکرین کی تھی۔
یہ لوگ اتنی ٹھنڈی میں باہر بیٹھے ہیں؟" فاریہ نے حیرت
سے کہا۔

نه صرف بیٹھے ہیں بلکہ چائے بھی بن رہے ہیں۔"
انھیں دیکھ کر تو اب میدا بھی چائے کا موڈ ہو رہا ہے۔ - فاریہ
نے حسرت سے کہا تو اس نے بھی ہاں میں ہاں ملائیں۔
میدا بھی۔

گئے سے ہوا کرتے ہوئے وہ آگ کے بیلنസ کو بد قدر رکھنے
کی کوشش میں پلکان ہو رہا تھا۔ کیونکہ دھوکہ سیدھا اس
کی
آنکھوں میں جا رہا تھا۔

ہٹ جاو حیدر بھائی! آپ کے بس کی بات نہیں ہے یہ۔"
اشعد کے کذن نے اسے وہاں سے پٹا کر خود اس کی جگہ
سنپھالی تھی۔ اب وہ لوگ تو ان کاموں میں ایکسپریٹ تھے
توبہ استغفار! کتنا مشکل ہے آگ پر چائے بنانا۔ وہ آنکھیں
مسلتے ہوئے ریاض کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔ فون وائریٹ
ہوا تو فوراً سے انباکس کھولا۔ جہاں یشفہ چائے لانے کو کہہ
رہی تھی۔

حوالی کے اندر جانے پر تو پابندی ہے۔ میں کیسے لا سکتا
ہوں بھلا؟ کسی کے ہاتھ بھجوادون گا۔"

تم خود لے کر آؤ گے تو پیوں گی ورنہ نہیں۔" اس نے قطعی
انداز میں کہ کہ بات ہی ختم کر دی تھی۔

کیا ہوا؟" ریاض نے اس کے فون پر جھکے پر سوچ سے
چھٹے کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

حولی کے اندر جانے کا کوئی راستہ ہے کیا؟"

" ہے نا! یہ رہا۔ حیدر کے سوال پر ریاض نے آرام سے اس
بڑے سے گیٹ کی جانب اشارہ کیا تھا جو سیدھا زنان
خانے میں کھلتا تھا۔

ادھر سے جاؤں گا تو میری لاش بھی کسی کو نہیں ملے
گی --

تو پھر؟ اس نے ناممکن سے پوچھا۔

یشفہ نے چائے بھیجنے کو کہا ہے۔ لیکن ساتھ میں یہ شرط
بھی رکھی ہے کہ میں خود دینے جاؤں"۔

یہ کیا بچوں والی بات ہے؟ اسے معلوم تو ہے یہاں پر دے
کی کتنی سختی کی جاتی ہے۔ بے شک ہم اشعد کے
دوست ہیں

لیکن یہ بلکل پسند نہیں کریں گے کہ غیر مرد حولی کے اندر
جا کر ---

یشفہ نے دو کپ لانے کو کہا ہے کیونکہ فاریہ بھی جاگ رہی
ہے۔ ریاض کی اس پیچ کو حیدر کی اس بات نے وہیں روک دیا
تھا۔

اتنی ساری چائے ہے۔ میں اکیلے کھاں پی سکیں گے اسے؟ اچھا ہے انہیں جا کر دے آتے ہیں۔ اسے فوراً سے پینترا بدلتے دیکھ حیدر نے اسے گھوڑا تھا۔
اور جائیں گے کیسے؟"

تو چائے لے جانے کا انتظام کر۔ راستہ میں تلاش کرتا ہوں"۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ بُدآمدے کے علاوہ پوری حوالی اندھرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ فاصلے فاصلے سے اسلحہ بددار گارڈز چاک و چوبند کھٹے تھے۔

"ریاض بھائی آپ ادھر خیریت؟" وہ اندر جانے کے لئے کسی چور راستے کی تلاش میں تھا جب علی نے اسے وہاں دیکھ کر خیرت سے پوچھا۔ وہ اشعد کا مامون زاد بھائی تھا جو اس حوالی میں رہائش پذیر تھا۔ عمد میں بھی اس سے چند سال چھوٹا تھا۔

"فاریہ باجی کو ڈھونڈ رہے ہیں؟" اس نے شوخی سے پوچھا تو ریاض نے بھائے بنانے کے بجائے اسے اعتماد میں لینے کا ہی فیصلہ کیا تھا۔

ارے نہیں یار! اصل میں تمہاری یشفہ باجی نے بھی چائے منگوائی ہے۔

"ہاں تو اس میں کیا مسئلہ ہے؟ میں دے آتا ہوں"۔
مسئلہ یہ ہے کہ اس نے حیدر کو چیلنچ دیا ہے کہ وہی لا کر

دے - لیکن ہم تو حویلی کے اندر جا نہیں سکتے۔"

"یہ تو کافی فلمی اور ڈائیرنگ سچویشن ہے - آپ کہیں تو میں کچھ مدد کروں؟ اس نے پر جوشی سے پیشکش کی -

"کیسے کدو گے مدد؟ اگر اندر ہمیں کسی نے دیکھ لیا تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں - اندر تو ویسے بھی سب سو رہے ہیں - کسی کو پتا بھی نہیں چلے گیا اور بے پردگی بھی نہیں ہو گی۔"

"میں گیٹ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہے پھر؟"

"ہاں ایک راستہ یہاں سے بھی ہے - یہ حویلی کے کچن میں جاتا ہے - آپ حیدر بھائی کو بلائیں میں یہاں سے گارڈز کو بٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"حملہ ہو گیا ہے - حویلی پر حملہ ہو گیا ہے - جلدی کدو اپنی جان بچاؤ۔" وہ جو کوئی بھی تھا خوفزدہ سی آواز میں چیخ چیخ کر اطلاع دے رہا تھا۔

پھر سے پر کھٹے گارڈز نے جب وہ آواز سنی تو فوراً سے اپنے اسلحے سنبرھالتے ہوئے ہاں سے نکل پڑے تھے۔ وہ جگہ اب بلکہ کلثید تھی - علی نے ان دونوں کو تدبیت اندر جانے کا اشارہ کیا تھا۔

ہد سو پھیلی چاند کی روشنی اور سرد ہواں کے تھپیڈوں سے کاپتے وہ لوگ گدم گدم چائے سے لطف انداز ہو رہے تھے۔

"حملہ ہو گیا ہے۔ حوالی کو بچاؤ۔" انہا دھنڈ بھاگتے ہوئے گارڈ کا رخ انہی کی جانب تھا۔ جو کچھ دید پہلے جتنے سکون سے بیٹھے تھے اب انتے کی حواس باختہ ہو چکے تھے۔

دھشتگردوں نے حملہ کر دیا ہے۔" ایک ہڈ بونگ اور بھگڑ سے مجھی ہوئی تھی۔

سارے گارڈ ان ڈاکوؤں کو ڈھونڈنے میں بے حال ہو رہے تھے جنہوں نے دو منٹ میں پوری حوالی کو ہلا ڈالا تھا۔

دھشتگردوں نے حملہ کر دیا؟" تیمور کے کان میں وہ آواز پڑی تو وہ کرسی دکھیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

حملہ! دھشتگردد! صرف دو لفظ اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ اتنے دنوں سے کوئی اس کے زیر عتاب آیا ہی نہیں تھا

تو ویسے ہی ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگی تھی۔

یا اللہ! انہیں کے باعث وہ کچن سے نکلتے ان دو نقوص کو دیکھ کر بے ساختہ ڈر کر یشفہ کے پیچھے چھپی تھی۔ جو خود بھی اس کی پیدوی کرتے ہوئے خود بھی چیخنے

ہی والی تھی کہ تمہیں حیدر کو دھیان سے دونوں ہاتھوں میں دو چائے کے کپ پکٹے وہاں آتے دیکھا تو بے ساختہ سکون کی سانس بھڑی۔ لیکن دوسرا سے ہی لمحے ۹۰ حیدرانگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا۔ لیکن اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ حیدر اتنا رسک لے کہ حولی کے اندر آئے کو تیار ہو جائے گا۔

انھیں یہاں کسی نے دیکھ لیا تو آج ہی جان سے چلے جاؤ گے۔۔۔ یشفہ نے اس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے ڈرانے والے انداز میں کہا۔

جان سے تو بہت پہلے ہی جا چکے ہیں۔ یشفہ کے پیچھے چھپے وجود کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے ۹۰ بڈبڑایا تھا۔

اب آپ دونوں جائے یہاں سے فوراً۔۔۔ یشفہ کو دھڑکا لگا تھا کہ کوئی انھیں وہاں دیکھ نہ لے۔

جان تھیلی پر رکھ کر تمہیں چائے دینے آیا ہوں۔ ایک شکریہ کا لفظ نہیں کیا جاتا تم سے؟ حیدر نے گھوڑ کر پوچھا۔
! شکریہ! مہربانی! نوازش! اب جاؤ یہاں سے۔۔۔ اس کا بس چلتا تو اسے بازو سے پکڑ کر خود ہی دروازے پہ چھوڑ آتی۔
اس طرح سے بھاوگی تو میں دھرنادے کر بیٹھ جاؤں گا۔ ذرا آرام سے اور پیار سے جانے کو کہو۔۔۔ حیور کی ڈرامے

بازیوں پر وہ محظ صبد کے گھونٹ بھر کر رہ گئی تھی۔
یشفہ انہیں کہو جلدی یہاں سے چلے جائیں۔ کسی کی
نظر بھی پڑ گئی تو بہت برا ہو گا۔ فاریہ کی خوف میں
ڈوبی دھیمی سی آواز دونوں کی ساعتوں میں بھی پڑی
تھی۔

بھابھی ڈر رہی ہیں"۔ حیدر نے شوکی سے ریاضن کو ٹھکا
مارا۔

ترھی کاجل سے لبریز پلکیں اڑھا کر فاریہ نے غیر ارادہ طور
پر اسے دیکھا تھا۔ جو نظریں چار ہونے پر دل میں بڑا ہوتے
شور کو نظر انداز کر کے حیدر کا بازو پکڑ کر جانے کے لیے
پلٹ گیا تھا۔ ان کے جاتے ہی انہوں نے بھی کب کا رکا ہوا
سانس بحال کیا۔

کیا صدورت تھی انہیں یہاں بلانے کی؟" فاریہ نے اس
کے ہاتھ سے اپنا کمپ لیتے ہوئے خفگی سے کہا۔
"یار مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ دونوں مجنووں کے جانشین
ہیں"۔

"اب روم میں چلو فورا، بہت ہو گئی تفریح۔"

چوکنے انداز میں وہ دونوں کوریڈور سے نکل کر اب بیرونی
طرف آگئے تھے۔ جہاں علی پہلے سے ان کا منتظر تھا۔
اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی بات کرتے وہ آواز ان

کے کانوں میں بھی پڑی تھی۔

حوالی پر حملہ ہو گیا ہے۔ بہاگو جان بچاؤ۔"

حوالی پر حملہ ہو گیا؟ حیدر اور ریاض نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا۔

علی نفی میں سد ہلاتے ہوئے انہیں بتانے لگا تھا کہ یہ اسی نے اپنے پلین کی وجہ سے افواہ پھیلائی تھی۔ لیکن وہ دونوں ہی اس کی سنے بغیرہ ہی حواس باختہ سے باہر کی جانب دوڑ لگا گئے تھے۔

اڑے حیدر بھائی! بات تو سنیں۔ ریاض بھائی! میدی بات تو سنیں۔" وہ آوازیں دیتے ہوئے ان کے پیچے پیچے بھاگ رہا تھا۔

جو کان لپیٹے، خوف سے چیختے ہوئے باہر کی جانب بھاگے جا رہے تھے۔ ڈر تھا تو صرف اس بات کا کہ اگر وہ بھی ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئے تو پھر سے شادی رک جانی

- ۱ -

سورج نکلتے ہی حوالی میں بھی صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔ ملازم بھاگم بھاگم کل کا پھیلاوہ سمیٹنے میں مگن تھے۔ روزانہ کی ایک مخصوص چھل پہل کے ساتھ کچھ غیر معمولی پن بھی اس ماحول میں چھنک رہا تھا۔ ساری رات کے جاگے وہ لوگ اب سونے کی تیاری کر رہے تھے، جب

باہر سے بلند ہوتے اس شور پر تیمور اور حارث متوجس سے ہو کر مہمان خانے سے باہر نکل آئے تھے۔ انہیں شاید کوئی چادر وغیرہ نہیں ملی تھی۔ جھجھی بلینکٹ کو ہی اپنے گرد پیٹتے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا ہے؟" کافی لوگ اپنی اپنی بندوقیں سنی ہالے جیپ اور کاروں میں سوار ہو رہے تھے، جب تیمور نے ایک لڑکے کو پکڑ کر پوچھا۔

زمینوں پر مسئلہ ہو گیا تھا تیمور بھائی! قرب کے گاؤں والے زبردستی وہاں قبضہ جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہلے بھی کئی بار ان کو ادھر سے نکالا ہے۔ لیکن اب شاید زیادہ تعداد میں لوگ آئے ہیں۔ اس نے تفصیل سے بتایا تو یہ سنے کے بعد تیمور کے دماغ میں "پھٹا! پھٹا!" کا سائز ن گونجنے لگا تھا۔

میں بھی ساتھ جاوں گا۔ میدی بندوق کدھر ہے؟ ٹھنڈ کی پرواہ کیے بغیر بلینکٹ ایک طرف پھینکتے ہوئے وہ جانے کے لئے تیار تھا۔

پاگل ہو گیا تھا؟ حارث نے اسے ڈپٹتے ہوئے زبردستی پکڑا۔ ہٹ جا وہ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

ان کو جانے دے لیکن تجھے نہیں جانے دوں گا میں۔ ان کا ذاتی مسئلہ ہے انہیں حل کرنے دے۔ تو پرانے پھٹے میں مت گھس۔ حارث اسے مضبوطی سے پکڑے کھٹا تھا۔

لیکن اس نے کہاں کسی کی سنی تھی۔ رات کو بھی کوئی ڈاکو، چور اس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ اب اس نے کہیں تو کسد پوری کرنی تھی۔

ارے چھوڑ دو حارت بھائی! وہ لوگ مجھے بھی چھوڑ جائیں گے۔ گازیوں کو دروازے سے نکلتے دیکھ اس لڑکے نے تیمور کو چھڑوانے کے لئے حارت کی منت سماجت کیا تھی۔ صرف دو دن میں ہی تیمور، اشعد کے کزنڈ سے اتنا گھول مل چکا تھا کہ اب وہ لوگ اپنے سارے کاموں میں اسے لازمی شدیک کیا کرتے تھے۔

مت جا، تیدے پاس لائنسنس نہیں ہے۔ تجھے جیل میں ڈال دے گی پولیس۔ حارت نے دھل کر اس کے ہاتھ میں پکڑی بڈی سی بندوق کو دیکھ کر کہا تھا۔

ٹینشن کیوں لیتے ہو حارت بھائی اور پولیس سے زیادہ ہماری چلتی ہے۔ وہ لڑکا فخر سے کالر کھٹے کر کے بولا۔

صبح کے کوئی گیارہ بجے کا وقت تھا۔ رات کو بارات تھی۔ جس کی تیاریاں سویرے سے ہی شروع ہو چکی تھیں۔ حوالی میں ایک بھگڑ سی مچی ہوئی تھی۔ صحن میں ڈھوول والے بھی ابھی سے پہنچ چکے تھے۔

فریش ہونے کے بعد وہ لوگ بدآمدے میں کھٹے سدمہ کی ندم گدم سی دھوپ کے ساتھ اس شادی والے ماحول کو

بھی انجوائے کر رہے تھے۔ اشعد نے انھیں کہا تھا کہ
ناشته باہد سے کریں گے۔ اس لیے وہ اس کے انتظار میں
کھڑے تھے۔

احمد رات کو کافی لیٹ پہنچا تھا۔ اوپر سے پھر ساری
رات حویلی پر حملے کی جھوٹی افواہ کی وجہ سے ویسے
ہی کافی ڈر و خوف میں رات گزرا تھی۔ اور صرف دو،
ڈھائی گھنٹے سوئے کے بعد وہ دوبارہ جاگ گئے تھے۔
صرف ایک احمد تھا جو ابھی تک سورہ تھا۔ اس نے ناشتے
کے لئے بھی جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور تیمور کی تو
ابھی تک واپس ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ چاروں ہی
اشعد کی گاڑی میں جا رہے تھے۔

جہاں وہ حویلی واقع تھی۔ وہ علاقہ شہد سے بلکل بہت کد
تھا۔ جو بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان گھبرا ہوا تھا۔ کچھ کلو
میٹر کی دوری پر وہاں ایک جھیل بھی تھی۔ سر سبز
درختوں کے جھنڈ، پہاڑوں پر گدی سفید برف، جھیل کے
لیے پانی میں اترتا سورج کا سنہدا عکس۔ وہاں اتنی زیادہ
خوبصورتی تھی کہ لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی
تھی۔ شہد کی بھاگتی دوڑتی، مصروف زندگی سے دور
ایک پرسکون کی جگہ۔ جہاں آئے کے بعد واپس جانے کا دل
ہی نہ چاہے۔

پرنس روڈ پر نعمت کدے سے ایک پر تکلف سا ناشتہ کرنے
کے بعد وہ لوگ کوئٹہ کو ایکسپلور کرنے نکل پڑے تھے۔ اشقدر
انھیں ساری جگہیں دکھاتے ہوئے ان کے بارے میں مختصرًا
بتاتا جا رہا تھا۔

"سب کو چھوڑ تو مجھے بس یہ بتا کہ جب تیرا ننھیاں بلوج
اور دھدیاں پڑھانے تو پہد یہ رشتے داری ہوئی
کیسے؟ کیمڈے کے لینس چیک کرتے ہوئے حارت نے اچانک
سے یاد آنے پر پوچھا۔ یہ بات تو وہ کب سے اس سے
پوچھنا چاہ رہا تھا

"میدے دادا اور نانا کی آپس میں دوستی تھی کافی زیادہ۔
اسی رشتے کو مظبوط کرنے کے لئے انہوں نے آپس میں
اپنے بچوں کی شادیاں کر دی تھیں"۔ صاف ستھری بد
کھاتی پتھریلی سڑک پر چلتے ہوئے اس نے شانے اچکا کر
بنتایا۔

"اور تو نے بھی اپنے نانا دادا کی تاریخ کو دھدا دیا"۔ حیدر
نے ہنسنے ہوئے ریاض کو دیکھا جو ان سے آگے ہٹی کی
جیبوں میں ہاتھ ڈالے، بے نیاز سا چل رہا تھا۔

"یہ کام مجھ سے زبردستی کروایا گیا"۔ اور یہ تو وہ
سب ہی جانتے تھے کہ اشقدر کا اشارہ کس طرف تھا۔
"دیکھ چوہدری! تیرا سالا کیا ارشاد فرمادا رہا"۔ تیلی لگا

کہ آگ بھڑکانا اس نے نیمور کی سنگت میں رو کد خوب
اچھے سے سیکھا تھا۔

"میں جانتا ہی نہیں ہوں اس کو۔" سنجدہ اور سخت لہجے
میں کہتے ہوئے اس نے اشعد کو پہچاننے سے صاف انکار
کر دیا تھا۔ یہ اس کی ناراضگی کا طریقہ تھا۔ جب کسی
بات پر وہ خفا ہو جاتا تھا تو سامنے والے کو ایسے ہی نظر
انداز کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا تھا۔

"تو مجھے نہیں جاتا؟" اشعد نے اچانک ہی اس کے شانے
پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑ کر آنکھیں سکیڈ کر
پوچھا۔

نهیں جانتا! سابقہ تاثرات چہرے پر سجائے اس نے اشعد کا
ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"یار ایسے مذہ نہیں آ رہا۔ ایک دو مکے تو مارو۔ کچھ گالیاں تو
دو۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ جیسے احمد کے گھر پر لٹے تھے، وہ
 والا سین ری گدائیں کرو۔ اس وقت تو ہم ٹھیک سے انجوائے
ہی نہیں کد پائے تھے۔" بڑے سے پتھروں پر بیٹھے حیدر
اور حارث دونوں ہی اشتیاق سے انہیں دیکھتے ہوئے اپنی
اپنی خواہش بتا رہے تھے۔

میں تیدی بہن کا شوہر ہوں کمینے انسان۔ مجھ پر ہاتھ اٹھایا
تو دیکھنا پرہد، پہلا ڈال دون گا۔ بارات لے کر نہیں جاؤں گا۔

اشعد کو آستینیں چڑھاتے دیکھ وہ دو قدم پیچے بٹتے ہوئے
انگلی اٹھائے اسے وارننگ دے رہا تھا۔

میدی بہن کے شوہد! بارات تو تیدے فرشتے بھی لے کر
آئیں گے۔” اطمینان سے کہتے ہوئے، اس سے پہلے کہ وہ
ریاض کو پکڑتا، وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

رک جا چوبدری! تجھے راستہ نہیں معلوم۔ بھٹک جائے گا
کوئٹہ میں۔” وہ بھی آوازیں دیتا اس کے پیچے ہی بھاگا
تھا۔

جبکہ وہ دونوں آرام سے وہیں بیٹھے اپنے کیمدوں میں وہاں
کے قدرتی مناظر سے متاثر ہوتے ہوئے انہیں عکس بند کر
لے رہے۔

کوئٹہ کے اسپیشل بھاری کامدار جوڑے زب تن کئے،

ہاتھوں میں بھر بھر کر کانچ کی چوڑیاں پہنے، ناک میں ایک
نگ کی لونگ اور کندن کے سیٹ پہنے وہ چاروں اب صحیح
معنوں میں شادی شدہ لگ رہی تھیں۔

باہر کی طرح حوبی کے اندر بھی اتنی ہی رونق اور ہلچل
کا سماں تھا۔ کراچی سے آئے سارے مہمان بھی ایک دن کا
گیپ ہونے کی وجہ سے کوئٹہ گھومنے پہنچنے نکلے ہوئے
تھے۔

خواتین لاੱج میں موجود اپنے ہی کپٹوں اور زیورات وغیرہ کی

باتوں میں مشغول تھیں۔ جبکہ لڑکیوں نے اپنی ہی الگ محفوظ
لگا رکھی تھی۔

"اتنا بھاری لہنگا!" وہ زرتار لہنگا ہاتھوں میں اٹھائے فاریہ
نے حیدانگی سے لائیہ کو دیکھا۔

"بھائی! میں یہ کیسے پہنون گی؟" وہ پریشانی سے بولی۔
اس کا تو دوپٹہ ہی اتنا بیوی ہے۔ دوپٹے کو دونوں ہاتھوں
میں اٹھائے اس نے مدد طلب نظرلوں سے ان تینوں کو دیکھا
جو اس کا باقی کا سامان بھی اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔
اب جیسا بھی ہو۔ پہننا تو تمہیں یہی پڑے گا۔ آخر کو
ریاض بھائی نے پورے دو ہفتے تک ڈیزائنر کا سد کھا کر
اپنی پسند سے بنوا ہے۔ یشفہ نے ہنستے ہوئے دوپٹے کو
اس کے سد پر ڈال دیا تھا۔

بیوی تو واقعی میں بہت لیکن تھوڑی دید کی تو بات
ہے۔ تم نے کون سا یہ پہن کر کداچی جانا ہے۔ "لائیہ نے
جیولری دیکھتے ہوئے لاپداہی سے کہا۔

لیکن بھا بھی --" وہ بسی سے انھیں دیکھ رہی تھی۔

دشت یعنی کے ایک پورا میدانی علاقہ، جو پہاڑوں کے
درمیان گھبرا ہوا تھا۔ ریلی ریسنگ کے لیے سب سے بہتر
اسپاٹ۔ بہت گھمانے کے بعد اشعد انھیں وہیں لے آیا تھا۔
ٹھنڈ کی وجہ سے وہاں عام دنوں کے مقابلے میں کم رش

ترہا۔ ورنہ تو لوگوں کا ایک جم غفید وہاں موجود ہوتا تھا۔ وہاں پہلے سے موجود دو گاڑیوں کی ریس اب اپنے اختتامی مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ دھوول اڑاتی گاڑیاں فل اسپیڈ سے دوڑتی جا رہی تھیں۔

یار کیا ڈرفلٹ مار رہا ہے یہ۔ گاڑی کے بونٹ پر چڑھ کر بیٹھے حیدر متاثر کن انداز میں اس ہائی لکس کو دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔ ریس ختم ہو چکی تھی لیکن ہائی لکس کا ڈرائیور جس طرح سے ڈرفٹنگ کر رہا تھا۔ ہر سو ریت کے مرغولے سے اٹھ کر اس گاڑی کو اپنی لپیٹ میں لے رہے اور جب کچھ دید تک اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کے بعد وہ جیکٹ پہنے اور ماتھے پر بندھے سیاہ بینڈ والا شخص ڈرائیونگ سیٹ سے اترنا تو اشعد نے ہنستے ہوئے اپنے ساتھ کھٹکے ان تینوں کے ہونق زدہ چہرے دیکھے تھے۔

"م تھے گھر پر سوتا ہوا چھوڑ کر آئے تھے۔ اور تو وہاں ڈرفلٹ مار رہا ہے؟" حیدر نے تیکھے انداز میں اسے دیکھا۔ جو ہاتھ سے گلوز کھینچ کر اتارتے ہوئے پانی کی بوتل سے گھونٹ بھر رہا تھا۔

"ایک ریس ہو جائے؟" احمد نے چلینجنگ انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

ریس وہ بھی تیرے ساتھ؟ معافی حضور! یہ میرے بس

کی بات نہیں۔ اس نے تو فوراً ہی ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

میدی طرف سے ریاض کرے گا۔ دوسرا ہی لمحے اس نے ریاض کو آگے کر دیا تھا، جو نفی میں سدھلاتے دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔

ریس کر لوں گا لیکن اس کے ساتھ نہیں کروں گا"۔

"آج تو حارت اور احمد کا مقابلہ ہو جائے۔ اشعد نے حارت کی گدلن میں بازو ڈال کر شہزادت سے پوچھا۔

"پھر تو ہو گیا فیصلہ، یہ ریس حارت ہی جیتے گا آج"۔

حیدر اور ریاض دونوں ہی دل جلے انداز میں ایک ساتھ بولے تھے۔

ابے مجھے کہاں یہ ریس ویس آتی ہیں؟ مجھے تو معاف ہی رکھو"۔ نفی میں سدھلاتے ہوئے اس نے دامن بچانا چاہا تھا۔

"ہم دونوں بمقابلہ تم تینوں! اب ڈیسائیڈ کر لو کہ ڈرائیو کون کرے گا تم میں سے"۔ احمد اسے اشعد کی گرفت سے نکال کر اپنی ہائی لکس کی جانب بڑھ گیا تھا۔

جس طرح سے وہ سلیپنگ بیوٹی کو لے کر گیا ہے۔ کیا مجھے نہیں لے کر جا سکتا تھا؟" اشعد کا گردیبان پکڑے وہ شدید جذباتی لہجے میں بولا تو وہ دونوں اس کی حرکت پر ہنس پڑے تھے۔

تو ہمارے ساتھ چل اور ڈرائیو تو کرے گا ریاض"۔ چابی اس

کی جانب اچھا لئے ہوئے اشعد نے باری باری دونوں کو کیا
ترہا۔

اور کچھ دیر بعد ہی وہ دونوں گاڑیاں پوری رفتار سے آگے
پیچھے دوڑتی ریت کے مدغولے اڑاتی جا رہی تھیں۔

حوالی سے بار بار فون آنے پر اشعد انہیں وہیں چھوڑ کر جا
چکا تھا۔ واپسی کا راستہ اس نے اچھی طرح سے سمجھا
دیا تھا۔ لیکن کئی گھنٹے بازار میں خواری اور کچھ شاپنگ
کرنے کے بعد وہ لوگ ایڈریس یکسر بھول چکے تھے۔ صرف
حوالی کا نام معلوم تھا

لیکن اس کا راستہ ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ شام بھی
ڈھلنے لگی تھی۔ حوالی میں بارات کی تیاریاں زوروں پر
تھیں۔ اور وہ لوگ کوئٹہ کی گلیوں میں بھٹک گئے تھے۔
اشعد اور روحیل میں سے کسی کا فون بھی نہیں لگ رہا تھا
کہ انہیں کال کر کے ایڈریس ہی پوچھ لیتے۔

وہ تینوں اپنے اپنے فون سے اشعد کو ٹدائی کر رہے تھے۔
جبکہ احمد ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ وقت اس نے گاڑی ایک
سائید پر روکی تھی۔ جہاں کوئی خواچہ فروش مختلف
اقسام کے میوه جات لیے کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ استرینگ پر
رکھے دوسرا سے کال اسکدیچ کرتے ہوئے وہ نارمل سے
ہی انداز میں اس شخص سے بات کر رہا تھا جبکہ پیچھے

بیٹھے حیدر اور ریانش حیدر سے آنکھیں پھاڑے اسے

روانی سے پشتہ بولتے ہیں سن رہے تھے -

"اس کو پشتہ آتی ہے؟ حیدر کی بلند بذیڈاہٹ پر حارت نے
تاسف سے اسے دیکھا تھا۔

ایک پٹھان کو پشتہ نہیں آئے گی تو کیا وہ پنجابی بولے گا؟"
مہربانی لالا دوسرا ہی لمحے وہ ماتھے تک ہاتھ لے جا کر
تشکر سے کہنے کے بعد گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

مغدب کے وقت جا کر وہ لوگ حویلی پہنچے تھے۔ جہاں ایک
الگ ہی رونق لگی ہوئی تھی۔ انتظام ہاں میں کیا گیا تھا۔
جو وہاں سے آدھے پونے گھنٹے کی مسافت پر تھا۔

"شکر ہے تم لوگ پہنچ گئے۔ ورنہ یہ لوگ بس کوئٹہ کے سرچ
آپریشن پر نکلنے والے تھے، اپنے دولہ کو ڈھونڈنے کے
لئے۔" تیمور انہیں دیکھتے ہی قدریب چلا آیا تھا۔

کدھر رہ گئے تھے تم لوگ؟ دو منٹ میں تیار ہو کر پہنچو۔
بہت لیٹ ہو گیا ہے -- اشعد نے عجلت میں انہیں کہا تھا۔

آدھے لوگ میرج بیچ ہاں میں پہنچ چکے تھے بارات کے
استقبال کے لئے۔ جن میں اشعد کی فیملی بھی شامل
تھیں۔ صرف ایک وہی تھا جو ان کے ساتھ ہی بارات میں
جانے والا تھا۔

گاڑی سے اتہ کر وہ لوگ بھاگم بھاگم مہمان خانے پہنچے

تھے۔ جہاں ان کے کپڑے وغیرہ سب پہلے سے تیار تھے۔

پوری گلی بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ آتش بازی کے رنگوں اور فائرنگ کی آوازوں سے فضاء میں الگ ہی شور گونج رہا تھا۔

بارات نکلنے کے لئے تیار کھٹی تھی اور دولتے صاحب سردار سے اپنے بلینکٹ میں چھپے ہوئے تھے۔

"ریاض میں تجھے آخری دفعہ کہہ رہا ہوں۔ اڑھ جا ورنہ بلکل اچھا نہیں ہو گا۔ اتنی دیر سے اس کی منتین تدلے کرنے کے بعد بھی جب وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو حیدر نے غصے سے دھمکی دی تھی۔"

پورے کمرے کو الٹ پلٹ کے وہ لوگ بھی جلدی جلدی تیار ہو رہے تھے۔ لیکن ہر دو سیکنڈ بعد بیڈ کے پاس آ کر اس کو جھٹ کنا نہیں بھول رہے تھے۔

"اس لڑکی سے شادی کرنے کے لیے تو مرا جا رہا تھا۔ اور اب ہو رہی ہے تو بستد سے نہیں نکل رہا؟"

"محبت اپنی جگہ! لیکن اس ٹھنڈ کو بھی تو دیکھو نا۔"

بلینکٹ سے چھرہ باہر نکال کر اس نے بھاری آواز میں کہا۔ ٹھنڈ اس سے زرا بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ سرداریوں کا موسم تو اسے ویسے ہی نا پسند تھا۔ کیونکہ بدلنے موسم کے رنگ سب سے پہلے اسی پر چڑھتے تھے۔ ابھی بھی

بخار میں مبتلا ہوئے وہ بیڈ سے اٹھنے کو بلکل تیار نہیں تھا۔ گمدے میں پیش کی وجہ سے کافی گدمائش تھی۔ لیکن وہ بھی اس کے لیے ناکافی تھی۔ وائٹ کھدر کے سوٹ میں ملبوس کریم شال کو گلے میں ڈالے، وہ روم میں داخل ہوا تو وہاں کا ماحول دیکھ کر ٹھہڑک گیا۔

"کیا ہوا ہے؟" اس نے ریاض کو دیکھ کر نا سمجھی سے پوچھا۔

"فلو" تھدما میٹد منہ سے نکالتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "دیکھو! ایک سو چار بخار ہے" - اس نے نقاہت زدہ سی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے پھر تو آرام کر۔ ہم تیدے بغیر چلے جاتے ہیں" - "ہے شک چلے جاؤ۔ نکاح ہوا ہے میدا۔ اس لیے مجھے زیادہ فکر نہیں ہے۔ ابھی وہ لوگ باتیں کہ ہیں رہے تھے کہ جبھی دروازہ دھڑ سے کھلا تھا۔ اور اشعد کے سارے کذنب اور انکل وغیرہ ایک ایک کے وہاں داخل ہوئے تھے۔

"ریاض بیٹا! طبیعت کو کیا ہوا؟ سب ہی تشویش زدہ سے اس کے بیڈ کو گھیر کر کھٹے تھے۔

"کچھ نہیں مامون! بس بخار ہے زرا سا۔" کہنیں ہوں کے بد اٹھتے ہوئے اس نے خود کو بشاش سا ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ چہدا دیکھو کیسے سرخ پڑھا ہوا ہے۔ حالت دیکھو زرا اس

کی۔ ڈاکٹر کو تو بلا کر لاو کوئی۔“ بڑے ماموں تھے بھی تھوڑے سخت مذاج کے اور جب انہوں نے تیز لمحے میں کہا تو سب ہی الرٹ ہوئے تھے۔

” اس کی صدورت نہیں ہے بڑے ماموں۔ ابھی بروفن سیدرپ کے دو بیچ پیسے گا تو دیکھے گا کہ کیسے اٹھ کھڑا ہے گا۔

حیدر نے انہیں با مشکل روکا تھا ورنہ تو ان سے کوئی بعید نہیں تھیں کہ کوئٹہ شہر کے سارے ڈاکٹرز حوالی میں جمع کر لیتے۔

” ادھر کیا کھٹے ہو تم لوگ؟ جلدی جاؤ کہیں سے بھی بروفین سیدرپ ڈھونڈ کر لاو۔ ماموں کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے سارے کمرے سے نکل کر اب حوالی کے اندر سیدرپ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

باہر ڈھول باجے بج رہے تھے۔ بارات کے انتظامات مکمل تھے۔ اور اندر سب دولہ کے لیے بخار کا سیدرپ ڈھونڈھنے میں بے حال ہو رہے تھے۔ جن میں سے علی نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانچ منٹ میں ہی قریبیں میڈیکل استور سے لا کر حیدر کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

دو چمچ سے کچھ نہیں ہو گا۔ جانی! تو پوری بوتل ہی پس لے۔“

اے نہیں یار! ہد چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے۔ میدے خیال سے آدھی بوتل ٹھیک رہے گی"۔ حارت اور حیدر کو تبادلہ خیال کرتے دیکھ ریاض نے بے چارگی سے احمد کو دیکھا۔ جو نفی میں سد ہلاتے ہوئے حیدر کے ہاتھ سے بوتل لے کر ریاض کے قریب چلا آیا تھا۔

شیرروائی اور کلمہ پہننے کے بجائے اس نے وہاں کے روایاتی طریقے سے ہی دولہا بننے کو ترجیح دی تھی۔ سفید کاٹن کے شلوار قمیض پر سفید ہی دستار نما پگڑی سد پر باندھے، اپنی سرخ و سفید سی رنگت و نقوش کی بنا پر وہاں کا مقامی باشندہ ہی لگ رہا تھا۔

پھولوں سے سجی وہ گاڑی میدیج ہاں کے سامنے روک کر اشعد ڈرائیونگ سیٹ سے اندر کد اندر کی جانب بڑھ چکا تھا۔ آخر کو اس نے بارات کا استقبال بھی تو کرنا تھا نا۔ ریاض کی گاڑی کے پیچے بارات میں ساتھ آئی گاڑیوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ جس میں سے سارے نوجوان نک سک سے تیار بابر اتھ کد اب دوبارہ سے پٹاٹے اور راکٹ جلانے کی تیاریوں میں تھے۔ جن کے ساتھ ملا تیمور بھی اپنے فائرنگ کے شوق کو پورا کر رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو چھ سات رائفل اپنے ساتھ چھپا کر کداچی لے جاتا۔

احمد اور حارث کے درمیان میں چلتے ہوئے جب وہ ہال کے داخلی دروازے پر پہنچا تو اشعد نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کو گلے لگا کر خوش آمدید کہا تھا۔ مہندی کی طرح اس بار بھی پردے کا خاص انتظام تھا۔ جبھی بیچ میں آڑ بنا کر خواتین اور مردوں کے لیے الگ الگ انتظام کیا گیا تھا۔ ان لوگوں کا استقبال بھی لڑکوں نے ہی پہلوں کی پتیاں نچھاوار کر کے کیا تھا۔ جو اب ڈھول کی تھاپ پر بھنگتے ڈال رہے تھے۔

نکاح پہلے سے ہونے کی وجہ سے تھوڑی دیر میں ہی کھانا شروع کروا دیا گیا تھا۔ خواتین والے حصے کی طرف ریاض کے علاوہ کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ سارے دل مسوس کد بیٹھے تھے۔

"اشعد کے ابی جان نے سلامی میں ریاض کو ہائی لکس دی ہے۔ اور آفریدی انکل نے پانچ سو گز کا پلات۔"

"تیدا کیا ارادہ ہے پھر؟" حارث نے کولڈ ڈرنک کے سپ لیتے ہوئے مشکوک سے انداز میں پوچھا۔

"ارادہ تو بہت نیک ہے۔ سوچ رہا ہوں ایک آدھ شادی میں بھی یہیں کر لیتا ہوں۔ اس نے رازداری سے اپنا پلین بتایا۔ افسوس کے ساتھ اشعد کی کوئی اور بہن نہیں ہے۔ اگر ہوتی بھی تو وہ تیدے سے تو ہرگز اس کی شادی نہیں

کرنے والا تھا۔ حارث نے مصنوعی افسوس سے سد ہلا کر کھا۔

"ہاں! لیکن اس کی گزند وغیرہ تو ہو گین ناں"۔ اس نے کہاں امید چھوڑنی تھی۔

"اگر تجھے اپنی کسی کذن کے لئے لڑکے کی تلاش سے تو یہ میدرا بھائی حاضر ہے"۔ حارث نے اچانک ہی وہاں سے گزرے اشعد کا بازو پکڑ کر روک لیا تھا۔ جو پہلے تو چونکا تھا۔ پھر مسکرا دیا۔

"لڑ کیاں تو بہت ہیں میدے خاندان میں۔ لیکن زات سے باہر شادی نہیں کرتے ہم"۔ کان کی لو مسلطے ہوئے ان نے خود کو بے نیاز سا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔
نہیں میں اندھا ہوں؟ یا پھر چوبدری راتوں رات پٹھانوں کی صاف میں شامل ہو گیا؟"

"وہ تو خیر ایک الگ معاملہ ہے۔" اشعد کو پتا تھا بدلتے میں یہی سننے کو ملے گا۔

"الگ معاملہ نہیں ہے بیٹا! یہ دھوکا ہے تیرا"۔ حیدر کینہ طور نظروں سے گھور کر بولا۔

"میں نے کیا دھوکا کیا ہے؟" وہ انجان بنا۔

چوبدری کو اپنی بہن دے سکتا ہے اور مجھے اپنی کذن کا رشتہ دینے میں صفا چٹ انکار کر دیا؟"

اس کو تو یہ اپنی جان بھی دے سکتا ہے لیکن تجھے اپنی

کذن کا رشتہ نہیں دے گا حیدر" - تیمور بھی تاسف سے کہتے ہوئے اس کی امید چھین رہا تھا۔

"یہ بے وفائی میں بھولوں گا نہیں اشعد آفریدی!"

"تو یشفہ سے اجازت لے لے بھاں شادی کرنے کی۔ پھر میں باخوشی تیردا رشتہ کھین نہ کھین کروادوں گا" - اشعد نے بھی تیر نشانے پر مارا تھا۔

"پھر تو ہو گیا کام۔ یشفہ نے اجازت نہیں دینی بلکہ گولی مارنی ہے اس کے سد میں" - حارت اور تیور نے ہنستے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارا تو وہ دل مسوس کر رہ گیا۔

سرخ اور سبز امتراج کے دیشم کے دھاگوں سے بنے بھاری اور کامدار لہنگے میں وہ شہزادیوں کے سے ہی ناز و ادا سے بیٹھی تھیں۔ میچنگ جیولری اور میک آپ نے اس کے حسن کو اور بھی دو آتشہ بنا دیا تھا۔ دیکھنے والے اس پر سے نگاہ ہٹا نہیں رہتے۔ روپ تو جیسے اس پر ٹوٹ کر بد سا تھا۔

وہیں سامنے سے وہ بھی اشعد اور روحیل کی معیت میں شہزادوں کی سی آن بان سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ اسے تو یہی لگ رہا تھا کے جیسے کوئی سلطنت فتح کر لی ہو۔

پہلے وہ آرام سے بیٹھی اپنی کزنڈ کا "اتن" نامی روایتی رقص النجوع کر رہی تھی۔ جو استیج کے سامنے دائیں کی صورت میں کر رہی تھیں۔ لیکن اب ریاض چوہدری کی وہاں موجودگی پر وہ بامشکل اپنی دھڑکنوں کو سنبھال پا رہی تھی۔

الگ رہا ہے پتا نہیں کتنے عرصے بعد تم لوگوں کی بھیانک شکلیں دیکھیں ہیں۔" ریاض کی خوش مذاہی تو آج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

وہ آرام دہ انداز میں اس کے برابر میں پورے حق سے بیٹھ چکا تھا۔ بغیر کسی خوف اور جھگک کے۔ شوخ سے انداز میں وہ ان لڑکیوں کو تنگ کر رہا تھا جو رسمیں کرنے کے لئے وہاں آئی تھیں۔

"ایسے کہو گے تو پھر ابھی یہ رخصتی کینسل کروادیں گے۔ پھر اکیلے واپس جانا کداچی۔" لائیہ نے ندوٹھے سے انداز میں کہا۔

"اے یہ ظلم مت کرنا۔ اب میدا صبر ویسے ہی جواب دے چکا ہے۔" لائیہ کے دھمکانے پر اس نے فوراً ہی پینترا بدلा تھا۔

"پچاس ہزار دو دو ہزار پلاٹی کے اور پچاس ہزار جوتا چھپائی کے، نکالو فورا۔" زر نور کے مطالبے پر اس کی آنکھیں حیدت سے پھیلی تھیں۔

خانزادہ انڈسٹریز کا مالک تمہارا شوہر، امیر ۔۔۔ میں صرف
چند فیصد کا تغیر ہو لڑ ہوں۔ میدے پاس اتنے پیسے کھاں
سے آئے گے بھلا؟" وہ حیدانگی سے بولا۔

بھیں معلوم ۔۔۔ تمہیں اچھی خاصی سلامی ملی ۔۔۔ اب
بھائے مت بناؤ۔"

"مجھے اکیلا جان کر پیسے بتھیاں کی کوشش کر رہی
ہو۔" اس طرف صرف روحیل اور اشقد ہی موجود تھے۔
دس ہزار لے لو کافی ہیں یہ۔" اس لیے پھر ریاض کی مدد
کو اشقد ہی میدان میں آیا تھا۔

اشقد کم از کم تمہیں تو ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔ لائبہ نے
ناراضنگی سے کہا۔

"لائبہ یار تم اتنی ساری ہو۔ یہ بے چارہ اکیلا ۔۔۔ اب
اخلاقی طور پر تو مجھے اس کا ساتھ دینا چاہیے نا؟" اس
نے بے چارگی سے کہا تو ریاض مسکرا یا تھا، وہیں ان
پانچوں نے منہ بنایا تھا۔

"ٹھیک ۔۔۔ پھر اس کی طرف سے اب تم دو گے پیسے۔"
ہاں تو دے دون گا۔ اس میں کیا حرج ۔۔۔؟ لیکن تھوڑا
ڈسکاؤنٹ تو ملننا چاہیے نا؟"

"کوئی ڈسکاؤنٹ کی بات نہیں کرنا۔ جتنے پیسے کہے ہیں
اب اتنے ہی چاہئے ہمیں۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔
"ابھی حیدر ادھر ہوتا تو کبھی تم لوگوں کو اپنا بزنس نہ

چمکانے دیتا۔۔۔ اشعد کو اس موقعے پر اس کی یاد شدت سے آئی تھی۔

رخصتی کے بعد سب دوبارہ حوصلی پہنچ کر جلدی جلدی پیکنگ میں مصروف ہو چکے تھے۔ کیونکہ دو گھنٹے بعد ہی کدھری کی فلاٹ تھی۔ صرف دو دن کا ہی اسٹے تھا ان کا کوئٹہ میں۔ بہت روکنے کے باوجود بھی ریاض نے رکنے سے منع کر دیا تھا۔

ورنہ تو رباب اور ہاشم چوہدری بھی ایک دن مزید رکنے کے لیے تقدیباً راضی ہو گئے تھے۔ ٹھنڈ اتنی زیادہ تھی کہ منفی ٹمپریچر تھا۔ صحن میں ہی بیج میں آگ جلا کر وہ لوگ دائیے کی صورت میں بیٹھے تھے۔

سدی سے کپکپاتے اچھی طرح سے بلینکٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ ورنہ تو گرم چادر اور جیکٹ بھی سدی کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئی تھی۔

وہاں بیٹھنا ان کی مجبوری تھی۔ اگر ایک دفعہ پیٹھ کی گرمائش والے روم میں چلے جاتے تو پھر واپس باہر نکلنا ناممکن ہی ہوتا۔ نیند اور ٹھنڈ سے مقابلہ کرنے کے لئے چائے کا اب تیسرا دور شروع ہو چکا تھا۔

کیا سوچ رہا ہے؟" اس نے تیمور کو گھری سوچ میں ڈوبے

دیکھا تو ٹھکا مار کر پوچھا۔ جو اس کی جانب متوجہ ہوتے
ہوئے سیدھا ہو بیٹھا تھا
پشاور سے کافی لوگ آئے تھے شادی میں شرکت کے
لئے۔"

"اشعد کا پورا دھدیال ہی پشاور میں ہے۔ اتنے لوگوں کا آنا
تو بنتا ہی تھا۔" تیمور کے اظہار خیال پر اس نے خفیف
سے شانے جھٹک کر کہا۔
"چل کیا رہا ہے تیڈے دماغ میں؟" حیدر کو تیمور کے انداز
مشکوک کر رہے تھے۔

جتنی تعداد میں یہاں بلوج ہیں۔ اس سے آدھی تعداد میں
پڑھان ہیں۔"

"تو؟" اس کے پراسرار سی بھید بھری مسکراہٹ پر حارث
اور حیدر دونوں ہی الجھن سے اسے دیکھ رہے تھے۔
کیا بولتے ہو؟ پھر ڈلوادوں ان دونوں قبیلوں کے بیچ؟ ہمارا
ٹائم بھی پاس ہو جائے گا اور چائے کے ساتھ منے سے ان
کی لڑائی بھی انجوئے کریں گے۔" وہ دونوں پیوسٹہ لب
اپنے اس دوست کی شکل دیکھئے جا رہے تھے۔ جو شکل
سے جتنا معصوم سا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا شیطانی دماغ
اتنی ہی تیزی سے لڑائی جھگڑوں والے منصوبے بناتا تھا۔
وہ پرچوش سا حیدر اور حارث کے تاثرات سے کوئی اندازہ
لگانے کی کوشش رہا تھا کہ آیا وہ دونوں اس کے خیالات سے

متفق ہے بھی یا نہیں؟ اگر تو وہ دونوں اس کے ۲م خیال
۶۷ سے تو پھر تو مذہ ہی آجانا تھا۔ یہ بنیاد بات کو جواز بنا کر
پھٹے کروانا تو ویسے ۲س اس کا چٹکیوں کا کام تھا۔
”کیا بولتے ہو؟“ ایک طرف وہ دو مختلف قبائلوں سے تعلق
رکھنے والے لوگ تھے۔ جو ان لوگوں کی وجہ سے ایکا کیے
بھائی چارے کی عملی مثال بنے ہوئے تھے۔ اور ایک یہ
ترہا جس سے پد سکون فضناں میں سانس لینا دو بھر لگتا تھا۔
اور یہاں آ کر تو اس کی ترجیحات بھی بدل چکی تھیں۔
پہلے تو ہاتھا پائی سے ۲س اس کا شوق پورا ہو جایا کرتا
تھا۔ لیکن یہاں تو جب تک آسمان گولیوں کی ترددابث سے
نہ گونجے تب تک اس کی جان کو سکون نہیں آتا تھا۔

ریاض کے علاوہ ان سب کا ارادہ واپسی میں ۴ئے روڈ جانے
کا تھا۔ لیکن سردى کی وجہ سے جب خون رگوں میں جمنے
لگا تو انہوں نے فلاٹ سے ۲س جانے میں عافیت جانی
تھی۔

ان دو دنوں کے دوران جتنی گالیاں وہ اشعد کو دے سکتے
تھے، انہوں نے دی تھی۔ ان کے مطابق تو وہ جان بوجھ کر
انہیں دسمبر کی سردوں میں وہاں لایا تھا۔ ورنہ شادی تو
موسم کچھ ٹھیک ہونے کے بعد بھی کی جاسکتی تھی۔

بھائی ایک بات سچ سچ بتا مجھے۔ آج واقعی میں تیرا
ولیمہ ہے یا پھر ملک ریاض نے پورا بحریہ ٹاؤن تیرے نام کد
دیا ہے؟"

حارت نے اس کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے پر سوچ انداز
میں پوچھا۔

ولیمہ ہے ہے بھائی! اگد بحریہ ٹاؤن اس کے نام ہو جاتا تو
یہ یہاں تھوڑی کھٹا ہوتا۔ موبائل پر فرنٹ کیمروں لگائے اپنے
بال سنوار کر پوز بناتے ہوئے تیمور نے لاپرواہی سے جواب
دیا۔

"پھر کہاں ہوتا؟" اشعد نے ناسم جھی سے پوچھا۔
مر چکا ہوتا ہارت اٹیک سے۔ پھر اس کی پر اپڑی پر میں
قبضہ جما لیتا۔"

اور میں تجھے آرام سے ہٹپ کرنے دینا کیا؟" تیمور کے آرام
سے کہتے پر حیدر نے اس کے ہاتھ سے فون چھینتے ہوئے
جواب دیا۔

اب تجھے ہر کام میں بیچ میں ٹپکنا لازمی ہوتا ہے کیا؟" پوز
خدا بونے پر وہ گھور کر بولا۔

میرے ٹپکے بغیر محفل میں بے رونقی رہتی ہے ناہ! اسی
لئے میں ٹپک کر چودہ سو چاند لگا دیتا ہوں۔"

چاند کو چھوڑ فلحال تو استیج کے بیک سائیڈ پر جا کر لائیٹس
چیک کروا۔ کچھ وائریز میں اسپارک ہو رہا ہے۔ "احمد نے

حکمیہ انداز میں کہا۔

اس کا معاوضہ میں الگ سے لوں گا۔ پاگل دولہ! اشعد اور
تیمور کے بیچ میں کھڑے ریاض کو مخاطب کرتے ہوئے وہ
آستین چڑھاتے ہوئے استیج کی جانب بڑھ گیا۔

"کیا ہوا؟" احمد نے سوالیہ نظرؤں سے ریاض کو دیکھتے
ہوئے پوچھا۔

کیا، کیا ہوا؟" اس نے بھی حیدانگی سے کہا۔
وہ تو پوچھ رہا ہوں۔ تجھے ہوا کیا ہے جو ایسے دانت نکل
رہے ہیں؟ سینے پد بازو باندھتے ہوئے اس نے سنجدگی
سے پوچھا

تو وہ جھینپ گیا جبکہ ان تینوں کے قہقہے بے ساختہ وہاں
گونجے تھے۔

تو سمجھ نہیں رہا یار! یہ تیمور کا ریکارڈ بردیک کرنے کا ارادہ
رکھتا ہے۔ حارت نے ہنستے ہوئے کہا۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اب شادی ہو گئی ہے تو کیا
بندہ خوش بھی نہ ہو؟" اس نے مصنوعی ناراضنگی دکھائی۔
۔۔۔

ابے خوش ہونے سے منع نہیں کیا۔ لیکن تجھے دیکھ کد ایسا
لگ رہا ہے جیسے بامشکل خود کو بھنگتے ڈالنے سے باز
رکھا ہو۔

اگر دل میں اتنے ہی لڑو پھوٹ رہے ہیں تو جا۔ دو چار

بھنگرے ڈال لے ۲۶ بھی تیدا ساتھ دے دیں گے۔ حیدر نے اسے زور سے پیٹ میں کھنی مارتے ہوئے آنکھ دبا کر پیشکش کی۔

تجھے میں نے کس کام کے لئے بھیجا تھا؟ واپس کیوں آگیا؟" اس کے آدھے راستے سے ہی واپس آنے پر احمد نے پوچھا۔

"بھائی! میں آئندن میں کی نسل سے تعلق نہیں رکھتا۔ نہ ہی میں "مارولز" کی سیدیز میں سپر ہیرو کا روپ پلے کر کے لوے کے آدم خوروں کو چبا کر ان کا قتل کرتا ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں بغیر کسی پلاس یا پینچ کس کے اپنے ہاتھوں سے ان بجلی کی وائیز کو پکڑ کر ٹھیک کر دوں اور پھر ذوروں کا جھٹکا کھا کر اس سے وفا دنیا سے کوچ کر کے اس بندر کا ولیمہ خراب دوں تو، او کے! میں کر دیتا ہوں یہ کام۔ حیدر کے نان استھاپ بولنے پر وہ تاسف سے سدھلا کر رہ گیا۔

"حیدر! اس تقدیر کے بجائے اگر تو اس بینکوئیٹ کے مینیجر کے پاس چلا جاتا تو یہ مسئلہ وہ خود ہی حل کروادیتا۔" "اوہ! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ اصل میں مجھے لگا کہ تو نے مجھے کہا ہے خود سے وائیز چیک کرنے کے لیے۔ وہ سدھجاتے ہوئے خفیف سا بولا۔

ملاوٹ تیدے عشق میں عطر اور شداب کی --

کبھی مہک جاتے ہیں، کبھی بھک جاتے ہیں--

مہندی اور بارات کے حوالے سے جتنی پلیننگ انہوں نے
کی تھی۔ وہ سب کوئٹہ میں شادی رکھنے کی وجہ سے
بیکار چلی گئی تھی۔ اپنی مرضی سے وہ لوگ ڈھنگ سے
ایک چیز بھی نہیں کہ پائے تھے۔ لیکن آج کداچی میں ہوئی
ولیمے کی تقدیر میں انہوں نے جی بھر کہ اپنے ارمان
نکالے تھے۔ اور پھر گھر واپسی پر بھی وہ سب رسمیں
کی گئی تھیں۔ جو شادی میں نہیں کہ پائے تھے۔

اور اسی دن ریاضن کی بدرتھ ڈے تھی۔ جسے وہ یکسر
فراموش کہ چکا تھا۔ وہ تو استیج پر بیٹھے تصاویر بنواتے
ہوئے جب حیدر نے بڑا سا آئیں کیک لا کر ٹیبل پر رکھا، تو
تب اسے یاد آیا۔ پھر بے ساختہ اپنے پہلو میں بیٹھی اپنے
دل کی ملکہ کو دیکھا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ اس سالگرہ پر اسے اتنا خوبصورت،
اتنا من چاہا تحفہ ملے گا۔

بلیک ڈر سوٹ میں ملبوس نیو پیٹر کٹ کے ساتھ وہ پرنس
چارمنگ بنا دھیمی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے ہوئے
تھا۔ جبکہ شہزادیوں کے سے ناز و ادا کو اپنائے وہ سر
اڑھائے لیکن نگاہیں جھکائے اس کے برابر میں بیٹھی، اس
کے وجود کو مکمل کر گئی تھی۔ پہلے وہ فاریہ آفریدی

تھی۔ لیکن آج وہ فاریہ چوہدری تھی۔ جس شخص کو اس کے بھائی نے اس کے لئے چنا تھا۔ وہ بد لحاظ سے اس کے لئے قابل ثابت ہوا تھا۔

استیج سے نیچے ایک جم غفیر لگا تھا۔ سب کے موبائلوں کے کیمروں کی فلش ان پر پڑ رہی تھی۔ فوٹو گرافر الگ اپنے اپنے کیمروں کیمروں سے تصاویر انارتے ہوئے اپنی مہارت کا ثبوت دے رہے تھے۔ ہونینگ کرتے ہوئے سب نے ایک شور سا ڈالا ہوا تھا۔ بٹے سے کیک پر ”ہیپی بدرھ ڈے آر سی“ کے الفاظ نمایاں طور پر چمک رہے تھے۔

بار بار دن یہ آئے۔

بار بار دل یہ گائے۔

تم جیو ہزاروں سال۔

یہ ہماری آرزو۔

اس کے سارے دوست، سارے کرند، سارے رشتے دار یک زبان ہو کر اسے وش کر رہے تھے۔

ایک خوبصورت سی مسکن ابھٹ لبیوں پر سجائے اس نے پہلے فاریہ کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس کے بعد چھٹی پکڑ کے کیک کاٹا تھا۔

فاریہ کے لیے اسکا عمل غیر متوقع تھا۔ لیکن پہل بھی جھکی نگاہوں کے ساتھ اس نے ریاض کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے وہ کیک کا چھوٹا سا پیسہ صرف چکھا تھا۔ جو بعد میں

وہ پورا اپنے منہ میں ڈال گیا تھا۔

جہاں اس نے کیک کاٹا، وہیں استیج کے اوپر سے پھولوں کی برسات شروع ہوئی تھیں۔ وہ دونوں چونک کر اوپر دیکھنے کے بعد بے ساختہ مسکراتے ہوئے اب ایک دوسرا کو دیکھ رہے تھے۔ ہزاروں نگاہوں سمیت دلوں میں بھی وہ خوبصورت لمحے جیسے قید ہو گئے تھے۔

”وہ اکیلا کھڑا ہے زرنور۔ یہی سہی وقت ہے۔ جاو اس کے پاس۔ مناہد نے لب شیر میں کا بول زبردستی اس کے ہاتھوں میں تھما کر احمد کی طرف اشارہ کیا جو تھوڑی دور کھڑا فون کان سے لگائے کسی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔

”م۔۔ میں نہیں جا رہی۔ وہ ڈانٹے گا مجھے۔ ”ڈے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے اس نے وہ باول دوبارہ مناہد کو پکڑانا چاہا جس نے اپنے ہاتھ فوراً پیچھے کر کے اسے پکڑنے سے انکار کر دیا۔

ایسے کیسے ڈانٹے گا؟ ہم ہیں نا، یہاں۔ کچھ نہیں کہے گا۔ لائیب نے بھی اس کا حوصلہ بڑھانے کو کہا۔ اگر ڈانٹا تو؟ ” کھلتے آتشی اور اورنج رنگ کے دیدہ زیب بھاری سے لہنگے میں سلیقے سے کندھے پر دوپٹہ سیٹ کیسے اس کے گلابی چہرے پر ابھی بھی ہچکچاہٹ تھی۔

”آپ اسے ڈالنے کا موقع ہی مت دینا۔ جیسے ہی کچھ بولنے لگے فوراً سے بھاگ کر آ جانا۔“ اپنے کد لی بداون بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے یشفہ نے بھی اسے اپنے مشورے سے نوازا۔

خود میں ہمت مجتمع کرتے ہوئے، گھری سانس بھر کر، ڈرتے ڈرتے قدم اڑھا کر کانچ کا وہ باول لئے احمد کے پاس آگئی تھی۔

جو ابھی تک فون پر مصروف تھا۔ ایش گرے ڈنر سوٹ میں ملبوس وہ محفد کی جان ہی تو بنا ہوا تھا۔

ایک گھری نظر اس کے دو آتشہ سراپے پر ڈالتے ہوئے، وہ فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا، جو کنفیوز سی لگ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ سینے پر بازو لپیٹے ہوئے اس نے زرور کے تاثرات جانچتے ہوئے پوچھا۔

وہ -- وہ احمد -- میں -- میں تمہارے لئے یہ لے کد آئی تھی۔ کھاؤناں پلیز!“ چکچاہٹ میں بامشکل اپنی بات پوری کرتے ہوئے اس نے خوبصورتی سے سچے لب شیرین کے باول کو اس کے سامنے کیا۔

میں میٹھے کا اتنا شوقین نہیں ہوں۔ تمہیں معلوم تو ہے۔“

معلوم ہے مجھے لیکن کبھی کبھی کھا لینا چاہیے۔“

”آج سے پہلے تو کبھی تم نے اتنا اصرار نہیں کیا۔ اب کے

اس کا انداز مشکوک تھا۔

"احمد میدی جان! ہمیشہ گٹوی کاٹی کے بجائے کبھی کبھار ایسے میٹھا میٹھا سا کچھ ڈیزرت بھی کھا لینا چاہیے۔ صحت کے لئے بہت اچھا ہوتا ہے۔" زر نور کو پتا تھا وہ اس طرح سے قابو آئے گا۔ جبھی شیریں لہجے میں ایک ادا سے بولی۔

وہ تو اس کے انداز تھا طلب پر ہی حیران رہ گیا تھا۔ اسے کہاں امید تھی کہ وہ آؤٹ ڈور گیدرنگ میں اس طرح سے میٹھا کھلانے کے لئے انسٹ کرے گی۔ جو بھی تھا زر نور کے بدلے انداز اسے ٹھہڑکانے کے ساتھ ساتھ خبر دار بھی کد گئے۔

"کھانے میں کوئی پر ابلم نہیں ہے لیکن مجھے آپ کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے محتدمہ۔" احمد نے اس کے بول کو دیکھتے ہوئے صاف گوئی سے کام لیا۔

"میرے ارادے بلکل ٹھیک ہیں۔ تم بتاؤ! کھاؤ گے یا نہیں؟" نہیں کھاؤں گا تو کیا ناراض ہو جاوے گی؟" وہ اس کے خفگی جتنے انداز کو انجوئے کرتے ہوئے اسے چھیڑنے کو بولا۔

"ہا! ہو جاؤں گی ناراض اور پھر کبھی بھی بات نہیں کہوں گی تم سے۔ یہ سوچ لینا تم۔" اس کے ندوٹنے انداز میں بھی دھمکی تھی۔ وہ بے ساختہ ہنس دیا۔
ہنسو مت یہ کھاؤ جلدی سے۔"

صرف ایک شرط پر۔ ہنسی کو مسکراہٹ میں بدلتے ہوئے
اسنے کہا۔"

کیسی شرط؟" وہ ٹھٹھکی۔

پہلے تم اس میں سے ایک چمچ لو۔ اس کے بعد پدامس میں
پورا باول ختم کر دوں گا۔ اسی کی شرط پر تو وہ بدک اٹھی
تھی۔

ہدگز نہیں! یہ اسپیشلی تمہارے لئے ہے۔ میں نہیں کہا
سکتی۔ نفی میں سد ہلاتے اس نے صاف انکار کر دیا۔
فضلول باتیں نہیں کرو احمد۔"

حب اتنے ندرے دکھا رہا ہے تو کیوں اس کے پیچھے پڑی
ہو نور بانو! مجھے بس ایک اشارہ ہی کر رہا ہو تو لب شیدریں
کیا میں یہ بول بھی سالم نگل جاتا لیکن افسوس! تمہیں
ابھی تک میدی اندھی بھری محبت پر یقین نہ آسکا۔ کہ
ہمیشہ کی طرح کوہ کاف کے جن کی طرح ٹپک کر وہ اپنی
زبان کے ساتھ ہاتھوں کو بھی زحمت دیتے ہوئے زر نور کے
ہاتھ سے باول جھپٹ چکا تھا۔

"بیڈھ غرق!" زر نور کے ساتھ ساتھ پیچھے کھڑی ان لڑکیوں
نے بھی بے ساختہ سد پر ہاتھ مارتے ہوئے اس شیطان کو
کوسا۔ جس کی وجہ سے سارا پلان چوپٹ ہوتا نظر آ رہا تھا۔
ارمان بھائی! اجازت ہو تو دس بارہ چمچ لے لوں اس میں
سے؟ کچھ سیکنڈ پہلے کی کار گزاری کو یک سد بھلائے

اس نے سعادت مندی سے احمد سے پوچھا۔

"تو میدی طرف سے اس کا شیشہ بھی چھالے کوئی ایشو
نہیں ہے۔ اس نے خوش دلی سے اجازت دیتے ہوئے زدنور
کے گلابی چھٹے کو سدخ چڑتے دیکھا۔

جہاں ہم دونوں کھٹے ہوں وہاں تمہارا ٹپکنا لازمی ہوتا ہے کیا
؟ اس نے غصے سے حیدر کو گھورا۔

"سمحہ کدو ناہ نور بانو! تمہارے بغیر میرا-- حیدر کی
بات ادھوری ہی رہ گئی تھی۔ لب شیریں سے بھدا چمچ
منہ میں رکھتے ہی نمک کا ایک تیز ریلا اس کے منہ میں گھلا
تھا۔ احمد پنستے ہوئے اس کے چھٹے کے بگٹے زاویے
دیکھ رہا تھا۔

مجھے تو پہلے ہی شک تھا اسی لئے منع کیا تھا لیکن
اف! تیدی اندھی بھدی محبت! احمد کا پنس پنس کر برا
حال ہو رہا تھا۔

یخ-- تھو-- نور بانو! اتنی کڈوی لب شیریں؟" ہاتھ کی
پشت سے لب رگڑتے ہوئے اس کے منہ کے زاویے بگٹے
ہوئے تھے۔

اگر مجھے معلوم ہوتا یہ تمہارے نصیب میں لکھی ہے تو
میں زند بھی ملا دیتی اس میں - اس کا انداز شدید جلا بھنا
تھا۔

اتنی محبت؟" منہ میں گھلی کڈواہٹ کو بھلانے وہ جذبات

سے مغلوب لہجے میں بولا۔ بس آنکھیں بھر آئے کی دید
تھی۔

پر کان چلمن مائیش کدی سارا دے --

کمو بے کش جان کو منان دے --

کوئٹہ اور پشاور سے آئے سارے کذنب ہال کے صوفوں اور
کرسیوں کو ایک جانب کر کے درمیان کی جگہ خالی کرنے کے
بعد اب دائیے میں گھومتے ہوئے محروم رقص تھے۔ جہاں
اشعد، ریاض کو استیحی سے اتار کر رقص میں ساتھ شریک
کر چکا تھا۔

وہیں حارث بھی اب احمد کے پیچھے پڑا تھا۔

"مجھے نہیں آتا۔ اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

اس میں کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے۔ جب ساتھ شریک ہو
گا تو خود ہی سیکھ جائے گا۔ وہ اس کی ایک نہ سنتے ہوئے
اسے پکڑ کر زبردستی دائیے میں ان کے ساتھ مل چکا تھا۔
تیمور اور حیدر پہلے ہی ان کا حصہ بنے ہوئے تھے۔

پورے ہال میں ایک وسیع دائیے کی صورت میں ایک جیسے
استیپس کرتے ہوئے وہ سب کافی پیارے لگ رہے تھے۔
جہاں سنگ کی آواز نے ایک سماں سا باندھ رکھا تھا۔

کوئٹہ سے واپسی کے دوسرا دن ہی ولیمے کے انتظامات

دیکھنے کی وجہ سے وہ زدا دید کو بھی آرام نہیں کر پایا
تھکن سے برا حال تھا۔ لیکن اس کے دوست اسے چھوٹے
کو تیار نہیں تھے۔ وہ اسے جی بھر کر تنگ کرتے ہوئے روم
میں جانے نہیں دے رہے تھے۔

”میری بات سنو تم لوگ! اب میری شادی ہو چکی ہے۔ اس
لیے میری جان چھوڑو اور اپنے گھر جاؤ۔“ مسکراہٹ دبا کر
اس نے خود کو سنجیدہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے،
سیدھا سیدھا انھیں دفع ہو جانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ ڈنر
سوٹ کا کوٹ بازو پر ڈالے۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے اس
کے وجہ چھرے پر بھی تھکن کے آثار تھے۔

شادی تو ہم سب کی ہوئی ہے لیکن تو اتنا بے وفا نکلے
گا۔ ہمیں خبر نہیں تھی۔ ”تیمور نے افسوس سے کہا۔
”شم آتی ہے زدا سی؟ حیدر نے تیکھے انداز میں پوچھا
تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
بلکل نہیں آتی!“

”تیدی اس بے وفائی پر میں آج تجھ سے سارے تعلق ختم
کر رہا ہوں۔ آج سے میں تجھے جانتا ہی نہیں۔ اس نے
سخت برا مانتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔
کیا تو مجھے جانتا ہے حیدر کو سو فیصد امید تھی کہ اس
سوال کے جواب پر وہ فورا سے ہنستے ہوئے اسے گلے لگا
کر کہے گا۔

اے حیدر! ہماری دوستی کیا ایسے ختم ہو سکتی ہے؟ تو
میری جان ہے یار۔"

میں بھی تجھے نہیں جانتا۔ " ریاض کے کمال اطمینان پر وہ
غصے کے گھونٹ بھد کر رہ گیا تھا۔

بار ایسا کیا ہے شادی میں؟ جو انسان کو اتنا بدل دیتا ہے۔
بلکہ اپنے دوستوں سے بے وفا بنا دیتا ہے؟" وہ اب ان کے
سامنے کھڑا محو سوال تھا۔ ریاض ان سب کو اللہ حافظ کر
کے جا چکا تھا۔ جو اس کی طرح ریاض کے روئے پر ناراض
نہیں تھے۔

بلکہ اس کے جذبات سے آگاہ تھے۔

تیری ہو جائے گی ناں تب لگ پتا جائے گا۔
لئے کب آئے گا وہ دن؟ کب میں دولہا بنوں گا۔" تیمور کے
کہنے پر وہ حسرت سے بول۔

اس کے ذوق کے مطابق، نفاست سے سچے اس روم میں
جیسے گلب کے پھولوں کی بھار آئی ہوئی تھی۔ نیم
اندھیرے ماحول میں موم بتیوں کی ٹھیٹھی روشنیاں
پرفسوں سا عالم بنائے ہوئے تھیں۔

سلور اور سی گرین گنڈا اس کی بھاری سی میکسی ابھی
تک زیب تن کیے اور ہاتھوں میں پہنی ہوئی انگوٹھیاں اتار
رہی تھیں۔

جب ایک لحظے کو رکھی تھی - کہاے کہ پر اسدار سی خاموشی میں ایسا کچھ تھا جو الگ تھا۔ کسی کی نظروں کی تپش اسے اپنے پشت پر پڑتی ہوئی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ انگوٹھیاں ٹیبل پر ڈال کر وہ مٹی تھی۔ لیکن سامنے ہی دروازے سے پشت ٹکا کہ کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ جامد ہو گئی تھی۔

دل میں تو اس شخص کے بھی طوفان اڑھے تھے۔ وہ کہاں تاب لا سکتا تھا اس حسن کی۔ وہ تو اس کی سادگی پر ہی مر مٹا تھا۔ اب جو اسے ان پتھیاروں سے لیس دیکھا تو صحیح معنوں میں حواس سلب ہوئے تھے۔

دو نفوس کی موجودگی میں ایک معنی خیز سی خاموشی کا وہاں ڈیرہ تھا۔ دنیا کو فداموش کیے وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی ذات کو بھی بھولے ہوئے تھے۔ درمیان میں چند قدم کا فاصلہ تھا۔ جسے عبور کرنے میں آج اسے کوئی خوف، کوئی ڈر نہیں تھا۔

جب اسے اپنی جگہ سے بٹ کر خود کی جانب قدم بڑھاتے دیکھا تو وہ نا محسوس انداز میں پیچھے ہٹی تھی۔ خاموش فضا میں اس کی چوڑیوں کی جلترنگ سی مچی تھی۔ لیکن ڈریسنگ ٹیبل راہ میں حائل تھی۔ دل میں انجائے سے خوف کنڈلی مارے بیٹھے تھے۔ جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہو چکا تھا۔ اس کے بعد تو وہ ریاض چوبدری سے کسی قسم

کے رحم کی امید نہیں کر سکتی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے
ٹیبل کو سختی سے تھامے، سدھ یا قوت سے نچلا لب
دانتوں تلے دبائے وہ سانس روکے کھڑی تھی۔

جبکہ مقابل اس کے سجے سنورے روپ کو دیکھتا دھیما سا
مسکراایا تھا۔ آج سے پہلے تک وہ صرف اس کی جھکی
نگاہوں کا ہی سامنا کر پایا تھا۔ اور اس میں جو اثر تھا، اس
نے ریاض کے دل کو کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ لیکن آج تو اس
کی اٹھی ہوئی

آنکھوں کا بھی دیدار کر لیا تھا۔ اب تو اسے مدد ہی جانا
چاہے تھا۔

"وہ کوئی خواب نہیں تھا۔"

"کوئی سراب نہیں تھا۔"

وہ مجسم حقیقت بنی آج اس کے سامنے تھی۔ اس کے
اختیار میں تھی۔

فاریہ چوہدری زرا سا اس کی جانب جھک کر زیر لب کہتے
ہوئے وہ اس کے گرد بازو پھیلاتا شدت سے گلے لگا گیا تھا۔
وہ پلکیں بھینپے اس کے کشادہ سینے پر سرد کھے کھڑی
اس کی دھڑکنوں میں مچے اشتعال کو باخوبی سن سکتی
تھی۔

"میری زندگی تو فراق ہے،"

"وہ اذل سے دل میں مکین سہی --"

کوئی اتنا ظالم کیسے ہو سکتا ہے آخر؟ سلگتے لہجے میں
کہیں گئی وہ دھیمی سی آواز اسے اپنے قدیب سے
سنائی دی تھی۔ سی گدین کامدار والے دوپٹے سے سجا
اس کا سد مزید جھکا تھا۔ زمانوں کا فاصلہ سمعٹ آیا تھا۔
ملن کے دیپ جل اٹھے تھے۔

"صدیوں سے محو سفر مسافر کو جب اچانک سے منزل مل
جائے تو معلوم ہے کہ کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

"وہ نگاہ شوق سے دور ہیں،"

"رگ جان سے لاکھ قدریں سہی --"

مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کسی نے مجھے ویدان
صحراء سے اٹھا کر پھولوں کی مہکتی وادیوں میں پھینک دیا
ہے۔"

بڑے سے منتشر دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ اندر
دربار سجا ہوا تھا۔ ستونوں کے ساتھ جڑی، جلتی مشعلوں
کی روشنی نے ذرے ذرے کو اپنی آغوش میں سمیٹا ہوا
تھا۔ جہاں محبت کے علاوہ کسی کا وجود تھا تو بس وہ
دونوں تھے۔ چوتھا کوئی نہیں تھا۔

وہ دونوں آمنے سامنے تھے محبت درمیان میں تھی۔ دونوں
کے دلوں کو مضبوط عشق کے دھاگوں سے باندھے اپنی
انگلیوں پر لپیٹ رہی تھی۔

"میں اتنا عاشق مذاج بندہ نہیں تھا۔ نہ ہی مجھے اس قسم کی شاعرانہ گفتگو آتی تھی۔ لیکن جب سے تم پر نظر پڑی، میں نے ایک الگ ہی ریاض چوبدری کو اپنے اندر سانس لیتے محسوس کیا۔ اس کی نظریں اس وجود سے ہٹنے کو انکاری تھیں۔ جس کی مٹھی میں اس کا دل قید تھا۔

"ہمیں جان دینی ہے ایک دن"

"کسی طرح سے وہ کہیں سہی--"

مجھے ایسے لوگوں سے سخت چڑھتی تھیں، جو صبح و شام محبت کا دم بھرتے رہتے تھے۔ کیونکہ میدے لئے یہ ایک بچکانہ سی بات تھی کہ کسی ایک شخص کو ہی اول و آخر بنانا کہ اس پر اپنی دنیا تمام کر دی جائے۔ اور اگر بات کروں محبت کی تو--"

پرفسوں ستاروں کو چھیڑ کر اپنی من پسند وہن بجا تی محبت نے الگ ہی سد فضا میں بکھیرے ہوئے تھے۔

مجھے یہ ایک فریب سے زیادہ کچھ نہیں لگتی تھی۔ جب تک میں نے اس کی لذت کو محسوس نہیں کیا تھا، مجھے صرف ایک دھوکے کی مانند لگتی تھی۔ اس کی مدهم گھمبید آواز ہواں کے دوش پر رقص کرتی کھلی کھڑکیوں سے ہو کر باہر آسمان پر

محوا استراحت ستاروں کو بھی اپنے سحد میں جکڑ دیں

"میں آپ کھینچے دار پر"

"جو نہیں کوئی تو ہمیں سمجھیں--"

لیکن تم سے ملنے کے بعد جیسے اس محبت نے مجھے
گستاخی کی سزا دینے کے لئے تمہارے سامنے گھٹنیوں
کے بد گدا دیا تھا۔

اور گدایا بھی اس طرح سے کہ میں اٹھنے کے قابل نہ رہ
سکا۔ "اپنا دل کھول کر اس کے قدموں میں رکھے وہ اپنی
داستانِ عشق کے ایک ایک ورق کو اس کے دل میں رقم کرتا
جا رہا تھا۔

"نه ہو ان پہ جو میدا بس نہیں"

"کے یہ عاشقی سے ہوس نہیں--"

تمہیں اس طرح سے یہاں دیکھ کر میں اپنی آنکھوں پر یقین
نہیں کر پا رہا۔ اپنی اکثر تنهائیوں میں، میں نے تمہیں اس
طرح سے سوچا تھا۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ حقیقت
میدی سوچوں سے اتنی بڑھ کر خوبصورت ہو گی۔

وہ اس کا بیڈ روم نہیں تھا۔

پھولوں کا ایک مہکتا ہوا باغ تھا۔ جہاں خوشبوئیں ساز بجاتی
تھیں۔ تتلیاں رقص کرتی تھیں۔ جہاں دنیا کے حجمیلوں کا
گزر تک نہیں تھیں۔

اس محبت کا میں نے جتنا مذاق بنایا تھا، اس نے مجھے

اتنا ہی خوار کدوا یا۔ لیکن اس خواری میں جو راحت تھی وہ
میرا دل ہی جانتا ہے بس۔

محبت کے بازار میں اس سوداگر نے اپنی جمع پونجی لے کر
قدم رکھا تھا۔ لیکن بدلتے میں بس بے قداریاں اور بے چینیاں
ہی اسکی جھولی میں ڈالی گئی تھیں۔ جنہیں اس نے
بمیشہ قیمتی متعار کی طرح سینے سے لگا کر رکھا تھا۔
آج اس کے صبر کا انعام اس کا منتظر تھا۔ انعام بھی اتنا
دلکش، اتنا خوبصورت کہ جس کے ہوش ربا سدا ہے سے نگاہ
بٹتی ہی نہ تھی۔

"میں انہی کا تھا، میں انہی کا ہوں۔"

"وہ میرے نہیں تو نہ سہی --"

"اپنی حکایت دل سنانے کے لئے تو مجھے شاید یہ زندگی
بھی کم پڑے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میرے جذبوں سے
ناواقف

نہیں تھیں۔ لیکن جو تمہارے عشق کی آگ میرے دل میں
لگی تھی۔ کیا وہ تمہیں محسوس نہیں ہوتی تھی؟" اگد
محبت کا کوئی روپ ہوتا تو وہ فاریہ چوہدری کی شبیہ میں
ہی ڈھلا ہوا ہوتا۔

آج سے پہلے اس نے صرف محبت کو محسوس کیا تھا۔
لیکن آج وہ اس کی دید سے بھی فیضیاب ہو چکا تھا۔ دید
بھی ایسی کہ جس کی پیاس ہی نہ بجهتی تھی۔ جتنا

دیکھو اتنی تڈپ بڈھتی جائے۔ اس کے دل کی حالت تو بس اس کی وارفتگی پر زید ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے کہاں آج سے پہلے اس ریاض چوہدری کا سامنا کیا تھا۔ وہ کسی بدلتے کی بات نہیں کر رہا تھا۔ کسی بد جانے کا مطالبہ بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس عاشق کو صرف اپنی محبت سے غرض تھی۔ اس کا دل تو ریاض کے ہاتھوں میں دے اپنے نازک سے ہاتھ میں دھڑک رہا تھا۔

"سد طور ہو، سد حشد ہو،"

"ہمیں انتظار قبول ہے ---"

"تم چاہو بھی تو میدی محبت کا اندازہ نہیں لگا سکتی۔
محبے تو تمہارے نام سے بھی محبت ہے۔ تمہارا نام ختم ہوتا ہے تو میرا نام شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ محظ اتفاق ہے تو اس سے بڑھ کر حسین اتفاق میدے لیے اور کوئی نہیں ہو سکنا۔"

چار حروف کو ملایا جائے تو محبت کا لفظ تشکیل پاتا ہے۔
جو چار حرف دو دلوں کو باہم جوڑ کر انہیں بے قداریوں میں جکر دیتے ہیں۔ میت کو میٹھے زہر کی طرح جان لیوا ہوتی ہے۔ جتنی مٹھاس اس کے ظاہر میں ہے۔ اتنا ہی زہر پر اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ایک دفعہ کسی کو اپنا مشکار کر لے تو اسے ادھ مواد کر دیتی ہے۔

"وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں،"

"وہ کبھی سہی وہ کہیں سہی--"

میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ تمہاری محبت نے مجھے ایک
لمحے کو بھی چین نہیں لینے دیا۔ جس دن تمہارا چہرہ
میدے دل میں بسا۔ اسی دن سے میدی بے قداریوں میں
فقط اضافہ ہے ہوا۔"

ہزاروں حسین چھے اس کے نگاہوں کے سامنے سے روز
ہی گزرتے تھے۔ لیکن فقط ایک چھرہ ایسا تھا جس پر اس
کی نگاہیں ایک دفعہ پڑی تو دوبارہ پلتنا بھول گئیں تھیں۔ وہ
چھرہ، جو اس کے دل کے دربار میں سجا ہوا تھا۔ جسے وہ
خود بھی
نظر بچا کر دیکھتا تھا کہ کہیں اس کی خود کی نظر ہی
نہ لگ جائے۔

"جو ہو فیصلہ وہ ستائیے"

"اسے حشد پہ نہ اٹھایے--"

"آئم سوری!" پور پور اس کے لیے سجی وہ دھیمی آواز میں
لبون کو جنبش دے کر بولی تو وہ سد کو ہلکی سی جنبش
دیتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

اس کی سیاہ غزالی آنکھوں پر پھرہ دیتی خمدار پلکیں زرا
دید کو اٹھ کر دوبارہ جھک گئی تھیں۔ اتنی سی دید میں وہ
مقابل کے دل میں طوفان مچا گئی تھی۔ کیا محبت کی
بھی کوئی آواز ہوا کرتی ہے؟ ایسا نہیں تھا کہ وہ آواز، وہ

لہجہ اس نے پہلی بار سنا تھا۔ لیکن جو اثر اور سحر اس میں تھا۔ وہ اسے پہلی دفعہ کی طرح ہی اپنی گرفت میں لے کر زید کر گیا تھا۔

"جو کریں گے آپ ستم وہاں،"

"وہ ابھی سہی وہ یہوں سہی --"

معافی تلافی کا وقت تو گزر چکا فاریہ چوہدری! سارے کھاتے کھل چکے ہیں۔ اب تو بس حساب کتاب ہو گا۔ ویسے بھی تمہارے عشق کی جو چنگاری میدے دل میں لگی تھی، وہ اب ایک بھڑکتا ہوا الاؤ بن چکی ہے۔ جو تمہارے اس سوری سے تو ہد گز بچھنے والا نہیں ہے۔ وہ سر نا پا عشق تھی۔ عشق کی جیتنی جاگنی مثال۔ اس کی آنکھوں میں ایسا نیشنہ تھا کہ وہ محظ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد ہی اس کے سامنے گھٹنے ٹیک گیا تھا۔ اس کی انا کا مجسمہ دھڑام سے زمین بوس ہوا تھا۔

"اسے دیکھنے کی جو لوگی تو

نصیر دیکھ ہی لیں گے ۲۶۔"

جب تمہیں دیکھتا ہوں تو ساری دنیا کھیں پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ تمہارے چہرے کے سوا مجھے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ کیا تھا اس کے خواب ناگ چہرے میں جو اس انا پسند کو اپنا اسید کر گیا تھا؟
اس کی نفرت سہارے کے بعد بھی وہ اپنے قدموں کو

پیچھے نہیں کد پایا تھا۔ ایک دفعہ اس کی جانب چلنا شروع کیا تو بس چلتا گیا۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ راہ میں جلتے کوئی اس کے پیروں میں چھالے ڈالنے لگے ہیں۔ اس پر تو بس ایک ہی عشق کی دھن سوار تھی۔ جس کے علاوہ کوئی اور آواز اس کے کانوں میں پڑتی ہی نہ تھی۔ دھن کنوں میں مچلتے شور سے گھبرا کر اس نے اپنا ہاتھ اس سے چھڑوانے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔ ”آج بھی یہ گدیز؟ اس کی نگاہوں میں ناراضنگی کا تاثر ابھدا۔

”میں نے صرف ایک بار اپنی حد سے بڑھنے کی غلطی کی ہے۔ جس کی تم مجھے ٹھیک ٹھاک سزا بھی دے چکی ہو۔ لیکن آج تو میں اپنے تمام اختیارات حاصل کر کے ہی تمہارے روپر و آیا ہوں۔ آج تو مجھ سے دامن مت بچاؤ۔“

”وہ ہزار آنکھ سے دور ہو“

”دو تہزاد پرده نشیں سہی۔--“

عشق کے ہزاروں جگنوں ان کے ارد گرد رقصان تھے۔ جن کی دلفریب سی روشنیوں میں گھرے ان کے چھرے الگ ہی نور سے چمک رہے تھے۔ بہت کم مسافت ہوتے ہیں جو محبت کے طویل و خاردار سفر کو تمام کر کے اپنی منزل کو حاصل کر لینے کا جشن مناتے ہیں۔

ان خوش نصیبوں کی فہرست میں ریاض چوبدری کا نام آج

سب سے اول درجے پر پوری شان سے دمک رہا تھا۔

ایک روشن اور چمکیلی سی روشنی کداچی شہد کو بیدار کر گئی تھی۔ پرندوں کے غول اپنے رب کی حمد و ثناء کرتے ہوئے رزق کی تلاش میں آسمان پر محو پرواز تھے۔ اتوار کی سوت سی صبح خانزادہ ہاؤس پر بھی اتھی تھی۔ جہاں وہ جاگنگ سے لوٹنے کے بعد لان میں ہی اخبار لیے معاشی صورتحال کی خبروں پر نظریں دوڑا رہا تھا۔

”لگتا ہے قدیشی انکل کے گھر نئے لوگ شفت ہو رہے ہیں۔ اپنے چائے کا مگ لے کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے زر نور نے اسے بتایا۔

تم کچھ بنا کر بھیج دینا۔ بمارے نیبڑہ ہیں، اتنا تو خیال ہمیں کرنا چاہئے ان کا۔ ”صفحہ پلتے ہوئے اس نے سردسی سا کہا۔

” وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے کہاں کچھ اتنا خاص بنانا آتا ہے۔ خانساماں بھی نہیں آیا آج تو اور پتا بھی نہیں ہے کہ کتنے لوگ ہیں۔

ایسا کرو تم چائے بنا دو۔ باقی میں باہر سے کچھ لا دوں گا۔“ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ ” وہ فوراً ہی چائے بنانے اٹھ کھٹی ہوئی تھی۔

جب سے وہ شادی ہو کر وہاں آئی تھی۔ اس محلے کے

صرف کچھ ہی گھدانوں سے دعا سلام ہو پائی تھی۔ ۶۹
تنهائی سے بور ہو جاتی تھی۔ لیکن اس علاقے میں رہنے
والے سارے لوگ ہی خشک مذاج اور اپنے خول میں رہنے
والے تھے۔ جو کسی خاص موقع پر میل ملاقات کے علاوہ
ویسے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے۔

کچھ دن پہلے ان کے گھد سے دو تین گھد چھوڑ کر سامنے
والی لائن میں رہنے والے، قدیشی صاحب گھد بیچ کر باہر
سیٹل ہو

گئے تھے۔ جو کسی فیلی نے خریدنے کے بعد رہائش
بھی اختیار کر لی تھی۔ زرنور اسی وجہ سے ایکسائنس
تھی کہ اگر اس فیملی
میں اس کی ہم عمد کوئی لڑکی ہوئی تو اس کی بوریت تو
ختم ہو گی۔

وہ چوکیدار کو وہاں بھیجنے کے بجائے خود ہی چائے کا
ترہ ماس اور کھانے کی ٹڈے لیے وہاں چلی آئی تھی۔
دونوں ہاتھ مصروف ہونے کی وجہ سے وہ بیل بجانے کی
کشمکش میں تھی کہ جھبی پھولوں کی خوشینما بیل سے
ڈھکا دو بداؤں گیٹ کھول کر کوئی باہر نکلا تھا۔
”اے!“ زرنور کو دیکھ کر وہ حیدان ہوا تھا۔

یقین مانو مجھے ہر گز امید نہیں تھی کہ تم اتنی جلدی
مجھے اپنا پتوسی قبول کے میدے لیے کھانا بنا کر لاو

"خوشگواریت سے کہتے ہوئے وہ اس کے ہاتھ سے ٹھے
اور تھدماں لے چکا تھا۔

جو نمک کا مجسمہ بنی کھٹدی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر
یقین نہیں آ رہا تھا کہ سامنے کھڑا شخص اب ساری زندگی
اسی گلی میں۔

اس کے ساتھ گزارنے والا تھا۔ گھردے شاک کی وجہ سے تو
وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ پائی تھی۔ جب حواس کچھ ٹھکانے
پر لگے تو وہ پلت کر دوڑتی ہوئی وہاں سے بھاگی تھی۔
پیچھے سے وہ اسے آواز میں ہی دیتا رہ گیا تھا۔

"میری بات سنو تم"۔ پھولے تنفس سے اسے مخاطب
کرتے ہوئے زرنور نے اس کے ہاتھ سے ریموت لے کر ٹھی
وی بند کر دیا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" احمد نے حیدانگی و ناسمحی سے
پوچھا۔

"یہ بلکل نہیں کہنا کہ تم انجان اور معصوم ہو"۔ وہ کاٹ
کھانے والے انداز میں بولی۔

نور مجھے بتاؤ گی کہ ہوا کیا ہے؟"

تمہیں نہیں معلوم کہ قدیشی انکل کے گھرد کون شفت ہوا

"؟" ۱

ظاہر ہے -- معلوم ہے مجھے "احمد نے مشکل سے اپنی ہنسی کو دبایا تھا -

"تم نے پھر بھی مجھے دھوکے میں رکھا؟" اس کی سبز آنکھیں نمکین پانیوں سے بھری تھیں -

"کیسا دھوکا؟"

"احمد! میں زرا دیر کے لیے اسے برداشت نہیں کر سکتی اور کہاں وہ اب ساری زندگی میدی آنکھوں کے سامنے رہے گی" -

اس کا تو سوچ سوچ کر سد پیٹا جا رہا تھا -

سنہرے اور سبز رنگ کا کامدار جوڑا، ہاتھوں میں بھر بھر کر چوڑیاں اور کنگن، صراحی دار گردن کی زینت بنا وہ خوبصورت سا لاکٹ، جو اسی نے تحفے میں دیا تھا۔ نازک سی گولڈ کی جیولری۔ ہاتھوں اور پیدروں پر لگی مہندی۔ کھلے ہوئے بالوں کو ڈھکے اس کا شیفون کا بار بار پھسلتا دوپٹہ -

بظاہر تو وہ بیڈ پر نیم دراز لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ لیکن اس کے کمرے میں شامل ہو چکے دوسرا شخص کا وجود بار بار اس کی توجہ اپنی سمت کھینچ رہا تھا۔ وارڈ روپ کی سیٹنگ چینچ کرتی وہ بھی اس بات سے انجان نہیں تھیں۔ سد! ہم بعد میں کنٹینیو کر لیں گے۔ آپ کا دھیان تو مجھے

کہیں اور ہی لگ رہا ہے " - ویدیو کال پر وہ اپنے اسٹینٹ سے میشنگ میں مصروف تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے کے دوران وہ اس سے کئی بار ایک ہی بات کو روپیٹ کروا چکا تھا۔ وہ بے چارہ بھی ایک ہی چیز اتنی دفعہ بتا کر شاید یہ بھائی پڑکا تھا کہ ریاض کے دماغ میں کچھ اور ہی چل رہا ہے ۔

"ٹھیک ہے ۔ ہم کل یہیں سے شروع کریں گے ۔ اس نے لمحہ ضائع کیے بنا، کال اینڈ کی تھی ۔

" آپ اس طرح سے کریں گی تو کمپنی کا دیوالیہ نکل جائے گا اور پھر احمد مجھے جان سے مار دے گا۔ اس کی بھاری آواز پر اس نے کچھ حیرانگی اور نا سموجھی سے اسے دیکھا تھا ۔

" میں نے کیا کیا ہے ؟ اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرانگی موجود تھی ۔ چھرے پر الجھن کے تاثرات تھے ۔ یہ معصومیت اور یہ بے خبری ؟ وہ تو بس اپنے دل کو ہی تھام لیا کرتا تھا ۔

تمہیں تو شاعری میں انٹرست ہے نا؟ میدے لیے بھی کچھ لکھو ۔"

" میں شاعری نہیں کرتی ۔ مجھے صرف پڑھنے کی حد تک پسند ہے ۔"

" تو پھر کچھ سنا ہی دو ۔"

" یہ کپٹے نکال دوں آپ کے ؟" اس کی فرمائش کو سرے

سے اگنور کرتے ہوئے اس نے ایک ہینگر نکال کر پوچھا۔
جو تمہارا دل کرے۔ زندگی کی سب سے بڑی خواہش اسے
حاصل ہو چکی تھی۔ اب ان چھوٹی موتی چیزوں میں اس
کی دلچسپی صفر تھی۔

ہینگر واپس لٹکا کر اس نے وارد روپ بند کر دی۔ پھر وہ اس
کے پاس ہی بیٹھ کے کنارے پر آبیٹھی تھی۔ بیک سے ٹیک
لگائے اس نے ناکبھی سے اس کی پھیلائی ہوئی دونوں
پتھیلیوں کو دیکھا۔ جہاں مہندی کا کافی خوش نما سارنگ
چڑھا ہوا تھا۔

شادی والی مہندی تو کب کی اتد گئی تھی لیکن رباب
ہاشم نے دوبارہ سے اس کو لگوائی تھی۔

امیدی مہندی میں آپ کا نام لکھا ہوا ۔۔۔ ذرا ڈھونڈ کر
دکھائیں۔ اس کا انداز کچھ شدارتی سا تھا۔

شادی میں نہیں لکھوا�ا تھا کیا؟" اس کے دونوں ہاتھوں کو
اپنی گرفت میں لیے، وہ تو اس کی مسکراہٹ پر ہی قربان
جا رہا تھا۔۔۔

تب میں نے لکھوانے سے منع کر دیا تھا۔
کیوں؟ اس نے بھنوں اچکا کر پوچھا۔

جب آپ مجھے اچھے نہیں لگتے تھے نا۔" اس کے بغیر
چکچاہٹ کے بدملہ اظہار پر وہ دنگ ہی تو رہ گیا تھا۔
اور اب؟۔

اب صحیح لگتے ہیں۔

صحیح مطلب؟

یعنی کہ بدے بھی نہیں لگتے اور اچھے بھی نہیں لگتے۔
بس ٹھیک ہی لگتے ہیں - وہ اس کے تاثرات پر مسکراہٹ
دباتی بے نیازی سے کہے جا رہی تھی۔

"مجھے گھدا صدمہ پہنچا ہے تمہاری اس بات سے" - اس
کے ہاتھ کو اپنے دل کے مقام پر رکھے وہ افسوس سے بولا۔
میں نے آج تک ہمیشہ اپنے لئے ستائش کے الفاظ سنے
ہیں۔ اتنی لڑکیاں میرے عشق میں پاگل تھیں اور میری
بیوی کو میں کسی قابل ہی نہیں لگتا۔؟"

لڑکیاں آپ کے پیچھے پاگل تھیں؟" فاریہ نے اپنا ہاتھ
کھنچتے ہوئے آبرو اٹھا کر اسے دیکھا۔

تمہیں کیا معلوم یونیورسٹی کے زمانے میں "آرسی کے
کتنے تدانے بختے تھے"۔

"تو پھر کتنے افئیڈز تھے آپ کے اس زمانے میں؟"
ہتھیلی پر چھدا گدائے اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

افئیڈز اور میرے؟ اللہ گواہ ہے اگر میں نے کسی کو دیکھا
بھی ہو تو۔"

بندھو! فاریہ نے ایسے سد جھٹکا جیسے اس کی بات پر
ایک فیصد بھی یقین نہ ہو۔

"آپ جس طرح سے میرے پیچھے پڑے تھے۔ اس کے بعد

تو میں آپ کی یہ بات مان ہی نہیں سکتی۔

سچ کہہ رہا ہوں یار! کہو تو تمہارے لاذے بھائی کی قسم کھانے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن سچ یہی سے کہ تمہارے علاوہ میں نے کسی لذکی کو نہیں چھینا آج تک"۔

میرے بھائی کی قسم مت کھائیں۔ اس نے خفگی سے منہ پھلا کر سائیڈ پر پڑا کشن اٹھا کر اس کے بازو پر دے مارا تھا۔

"بھائی سے اتنی محبت ہے۔ اور شوہد کی زرا سی بات پر اعتبار نہیں؟" ریاض نے اس کی کلائی کھینچ کر مصنوعی سا گھوڑتے ہوئے پوچھا۔

وہ روم کی بالکنی میں جھولے پر بیٹھی، کوئی کتاب ہاتھ میں لیے اس کی کھانی میں تقدیبا کھوئی ہوئی تھی۔ جب اچانک سے تیز چہنگاڑتی آواز پر وہ ڈر کر بوکھلا اٹھی۔ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گئی تھی۔ اگر اس کی بالکنی سے باہر جھانک کر دیکھو تو رات کے آٹھ بجے ہی پوری گلی سنسان اور ویدان پڑی تھی۔ اس علاقے کو تو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کراچی کا حصہ تھا۔ صرف پولز کی روشنی تھی یا پہد کچھ گھروں کے باہر جلتے بلب کی۔ آسان بھی ستاروں سے روٹھا ہوا بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔

ایسے میں وقفے وقفے سے "دیسپیسٹو" کی آواز پوری
گلی میں گونجتی ہد زی روح کو خوفزدہ کرنے میں پوری طرح
کامیاب نظر آتی تھی۔ گلی میں وہ واحد گھر تھا جو برقی
قمقموں سے روشن تھا۔

محلے والوں کو تو یہی معلوم ہوا تھا کہ جو نئے لوگ قدیشی
صاحب کے بنگلو میں شفت ہوئے ہیں۔ ان کے بیٹے کی
شادی ہے۔ لیکن شادی کی خوشی میں اتنا پاگل کون ہو تا
ہ بھائی؟ لڑ کا خود ہی اپنے کمرے کی بالکنی میں
اسپیکرڈ لگا کہ کانوں پر ہیڈ فونز چڑھا کر عجیب و غریب
گانے لگائے سد دھنتا رہتا تھا۔ اس کی بلا سے محلے والوں
کی نیندیں حدام ہو جائیں۔ اسی دوران وہاں دو گاڑیاں ہارن
بجاتی آگے پیچھے وہاں آ رہی تھیں۔

"میدے یار کی شادی ہے" ۔ گاڑیوں میں سے دو چار نفوس
نکل کر اب اس گھر کے باہر بھنگٹے ڈالنا شروع ہو چکے
تھے۔

ساتھ ہی اونچے سروں کا مقابلہ بھی جاری تھا۔ زر نور نے
خشتمگین نظروں سے ان چاروں کو دیکھا تھا۔ جنہوں نے ایک
منٹ میں ہی پوری گلی کو سد پر اٹھا لیا تھا۔

تمہارے دوستوں نے پوری گلی میں رونق لگائی ہوئی ہے
اور تم یہاں کر کٹ میچ دیکھ دے ہو؟" زر نور نے بالکنی کا

گلاس ڈور بند کرتے ہوئے طنزہ کہا۔

تم کہو تو انہیں بھی بلا لیتا ہوں یہاں۔ وہ کدکٹ میچ بھی دیکھ لیں گے اور یہاں بھی رونق لگ جائے گی۔ احمد کا انداز صاف چھڈنے والا تھا۔

"اگر تم نے ایسا سوچا بھی تو میں بتا رہی ہوں کہ یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔" زر نور اسے گھور کر دھمکایا۔
وسے اس بنگلو کی قیمت کیا ہو گی جو ظہور انکل نے خریدا
۔۔۔ اس نے پر سوچ سے انداز میں پوچھا۔
یہی کوئی سولا سو لا سو تاراں کروڑ۔

"اتنے پیسے ہیں تمہارے پاس؟" اس نے بے نیازی سے بتایا تو زر نور نے بے قدری سے کہا۔
ہاں لیکن کیوں؟" اس نے ناکبھی سے زر نور کو دیکھا۔
احمد کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟" وہ اچانک ہی اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھامے جذباتی نظروں سے اسے دیتے ہوئے کا چھ رہی تھی۔

"

یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے پر جھولتی لٹلوں کو سنوارا تھا۔
تو پھر ابھی جا کر وہ گھر خریدو۔" دوسرے ہی لمحے وہ دھونس سے بولی۔

"وہ نہیں بیچے گا۔" احمد نے بسی سے کہا تو وہ تنے

تاثرات کے ساتھ رخ موڑ گئی تھی۔

"تمہیں مجھ سے محبت ہی نہیں۔ اگر ہوتی تو کبھی یہ حدکت کرتے ہی نہیں۔ تم نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔"

حیدر نے یہاں پر گھد لیا ہے۔ اتنے تم"۔ اس کے گلے شکوئے ابھی جاری تھے کہ تباہی نیچے سے ایک شور بلند ہوا تھا۔

جسے دھیان سے سنا جائے تو معلوم ہو گا کہ تین چار لوگ مل کر زور و شور سے ان کے گھد کا گیٹ بجانے کے ساتھ ساتھ اسے باہر آنے کے لئے آوازیں دے رہے تھے۔

"جان من! دکھ میں آگیا تو بھی باہر آ!"

"بس ابھی تھوڑی دید میں آرہا ہوں۔ اس کی تیکھی نظروں کو نظر انداز کر کے پیار سے کہتے ہوئے، وہ جوتے پہن کر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اور یہ تو زرنور کو بھی معلوم تھا کہ یہ تھوڑی دید کتنے گھنٹوں پر مشتمل ہو گی۔

بظاہر تو وہ کتاب پڑھنے میں ہی مگن تھی لیکن چور نظروں سے اس کی حدکات و سکنات کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ جو بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی درازیں کھنگالتے ہوئے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اسے اچھے سے معلوم تھا کہ وہ کیا

ڈھونڈ رہا ہے - اس لیے بے نیاز بنی بیٹھی اپنی خدمات پیش کرنے کی بھی آفر نہیں کی تھی۔ چند لمحے بعد وہ گھری سانس بھرتے ہوئے اس کے پاس چلا آیا۔

فاریہ میدم! آپ بتانا پسند کریں گی کہ میرے سکریٹ اور لائٹ کو کہاں چھپایا ہے آپ نے؟ سینے پر بازو لپیٹے وہ اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا جو اس کی راکنگ چئیر پر پیدا پور کیے بیٹھی تھی۔

چھپائے نہیں پیں میں نے -- صفحہ پلٹتے ہوئے اسنے کہا -
”پھینک دیے پیں۔
کیوں؟“

”کیونکہ وہ ایک نہایت بدی عادت ہے - جو مجرے سخت نا پسند ہے“

”وہ بدی عادت مجرے تمہاری وجہ سے ہی لگی تھی۔“
ایک تو آپ ہر بات کا زمہ دار مجرے ٹھہردا دیتے ہیں۔ کہ تمہاری وجہ سے میں اتنا صندی ہو گیا۔ پاگل ہو گیا، نشے کے عادی ہو گیا، وغیرہ وغیرہ۔ وہ سخت برا مان گئی تھی۔
”نشے کا عادی ہو گیا؟ یہ میں نے کب کھا؟“ ریاض نے حیثت سے پوچھا۔

”اسموکنگ بلکہ انٹھائی اسموکنگ بھی نشے کی ہی ایک قسم ہے جس کے آپ عادی ہوتے جا رہے ہیں۔“
”میں پہلے نہیں کرتا تھا۔“

امعلوم ہے مجھے اجب اشعد بھائی سے لڑائی ہوئی تھی
آپ کی۔ تب آپ نے شروع کی تھی۔
”حیرت ہے میں تو تمہیں اتنا ہے خب دسمجھتا تھا۔ لیکن تم
نے تو میدے پل پل کی خب رکھی ہوئی ہے۔ کیا بات ہے
تمہاری“۔

اس کے مسکرا کر دنپی سے کہنے پر وہ گٹ بڈا گئی تھی۔
”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”مجھے تو ایسی ہی لگتی ہے۔ اس نے ہنسنے ہوئے اس
کے ہاتھ سے کتاب اچک لی تھی۔ جسے وہ چھڑے کے
سامنے کیے سرخی چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔
”ویسے میدا پہلا امپریشن کیسا پڑا تھا تم پر؟“ وہ اس کے
سامنے ہی بیٹھ کے کنارے پر بیٹھ گیا تھا۔ اشعد اور لائبہ
کی مہندی کے روز ہوا ان کا پہلا آمنا سامنا فاریہ کے ذہن
کے پردنے پر نمودار ہوا۔

”انتہائی خداب“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”اور دوسرا؟“ اس نے بفید ناراض ہوئے پوچھا۔ اب کے ائیر
پورٹ کا وہ منظر اس کی نظروں کے سامنے لہرایا تھا جب
وہ اشعد کے ساتھ اسے ریسیو کرنے آیا تھا۔

”اس سے بھی زیادہ برا۔“ اس کے ثانیات سابقہ تھے۔

”ان کے بعد بھی مجھ سے ہوئے ہڈ ٹکداو پر تمہاری ایک
ہی جیسی رائے ہوتی ہے یقینا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ میں

تمہیں برا کیوں لگتا تھا؟" مٹھی گال تلے رکھے وہ فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ ارد گرد کی پدوواہ کیے بغیر ایک لڑکی کو گھورتے رہیں گے۔ وہ بھی اپنے دوست کی بہن کو! اور مزید یہ کہ اس کا ہاتھ پکڑ لیں گے، اسے کہیں گے میں تم سے عشق کرتا ہوں۔ مجھ سے دامن مت بچاؤ، مجھ سے دور مت جاؤ۔ تو کیا اس سے آپ کا امپریشن کسی پر شریف انسان کا جائے گا؟" اس نے میٹھے سے طنز میں پوچھا۔

افکورس ناٹ! لیکن میدے دل پر یہ سانحہ پہلی بار گزرا تھا اور میں کون سا آئے دن کسی نہ کسی کے ساتھ ڈیٹنگ کر رہا ہوتا ہو جو مجھے ان نزاکتوں کا معلوم ہو تو۔"

اتنے مقصوم بھی نہیں ہیں آپ، جتنا میرے سامنے بنتے ہیں۔

اتنا بد معاش بھی نہیں ہوں جتنا تم مجھ سمجھتی ہو اور اگر میں ایسا ہو تو پہلی فرصت میں آپ کو آپ کے گھر سے غائب کروادیتا۔

آپ مجھے کڈنیپ کر لیتے؟"

ہاں بلکل! میں ایسا کر لیتا۔ لیکن کیونکہ میں نا تو بد معاش ہوں اور نہ ہی بزدل کہ دنیا کا سامنا کرنے کے بجائے تمہیں چوری کے اپناتا۔"

بلکل! آپ بزدل نہیں، آپ بہادر ہیں۔ جبھی تو پوری دنیا میں

اپنے عشق کی داستان کو مشہور کروادیا۔ پر کسی کی زبان پر ریاض اور اس کی صندی محبت کا ہی ذکر ہوتا ہے بس -- سر جھٹکتے ہوئے کہہ کر وہ چئید سے اٹھ کھٹی ہوئی تھی۔

جیسا بھی ہوں، بس تمہارا ہے ہوں" - وہ مسکراتے ہوئے سر شار سا بولا۔

واسیع و عریض رقبے پر پھیلا حمزہ مینشن بے شمار خوشناما پھولوں کی بیل سے ڈھکا ہوا، باہر سے جتنا خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ اندر سے اور بھی زیادہ پیارا تھا۔ جس کا بداؤن کلد کا گیٹ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ کافی سارے لوگ عجلت میں کام میں مصروف اندر باہر جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ پورے بنگلو کو لائنس اور پھولوں سے سجا�ا جا رہا تھا۔

گردیان میں پلاس اٹکائے اور کچھ پھولوں کی لڑیوں کو گلے میں لپیٹے، رف علیے اور بگٹے موڈ کے ساتھ وہ ملازموں کی مدد کروانے کے ساتھ ساتھ انہیں انسٹرکشنز بھی دے رہا تھا۔ اسی وقت وہ دونوں نک سک سے تیار وہاں داخل ہوئے تھے۔

جب اسے اس حلیے میں دیکھا تو ٹھیک کر رکے - "کیسے ہیں آپ" تیمور نے خوشدلی سے اس سے

مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔ نظر تو آہی رہا ہو گا۔ جواب اسی اکھڑ انداز میں دیا گیا تھا۔

"یار اس الیکٹریشن کی شکل حیدر سے کتنی، مدد رہی ہے ناہ ویسے؟ تیمور نے پر سوچ نظر ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے ساتھ کھڑے حارث سے پوچھا۔

"ہاں یار! واقعی میں" اس نے بھی اثبات میں سدھلاتے ہوئے مصنوعی حیدت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان دونوں کے اس ڈرامے پر حیدر مزید تپا۔

"ایک لگاؤں گا تم دونوں کو۔ وہاں سے گزرتے نو عمد ملازم لڑکے کو بلاوجہ ہیں سد پر تھبیٹ رسید کرتے ہوئے، اس کے ہاتھ سے لائسنس چھین کر وہ تیمور پر اللٹا تھا۔

"حیدر بھائی! یہ چوتھا تھبیٹ ہے۔ اب پانچواں مارا تو میں کام چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ وہ بلبلاتے ہوئے دھمکا کر بولا تو حیدر کا مزید ایک تھبیٹ اسے پڑا تھا۔

"تیدی شادی ہے اور تو ایسے غصے میں بھرا گھوم رہا ہے خید تو ہے؟"

کہاں سے ہو گی خید؟ کہاں سے ہو گی؟ احمد کو میرا زرا سا خیال نہیں ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ میری شادی پر بھی کہہ رہا ہے کہ آفس آ کر کام کروا۔ میں نے منع کر دیا تو مجھے یہاں کا کام دے دیا۔ "وہ پہولے منہ کے ساتھ بولا تو

وہ دونوں بے ساختہ ہنسے تھے۔ احمد کو یہ حرکت کرنے کے لئے کہا بھی تو ان دونوں نے ہی تھا۔

اور بنج جوٹے میں کلائیوں میں گیندے کے پھولوں سے بنے گجدے پہنے وہ لاٹنچ کے سنگل صوفے پر پید اوپر کد کے نوڈلز کا پورا بول ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ ارگینزا کا بڑا سا دوپٹہ بھی کندھے کے ایک طرف جھوول رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ مايون کی دلہن ہے۔

ماربل کے فرش پر قالین بچھا کد بہت سے گاؤں تکیوں کے ساتھی ڈھولک بھی پڑی تھی۔ ویسے تو حمین صاحب کا تقریباً سارا خاندان ہی باہر کے ممالک میں سیٹل تھا۔ لیکن پیشفہ کی شادی کی جب خبر انہیں پہنچی تو ایک ایک کر کے سب ہی وہاں پہنچنا شروع ہو چکے تھے۔ سالوں سے باہر رہنے کی وجہ سے ان سب کے لیے تو دیسی ویڈنگ کافی دلچسپی کا باعث تھی۔ اس لیے ایک ہفتے کے لیے ہی صحیح لیکن سب آئے صدور تھے۔ ابھی بھی سب لاونچ میں اکھٹے ہو کر شادی والے گانے گانے کی بھد پور کوشش کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ”مجھے تو ابھی بھی نہیں یقین نہیں آ رہا کہ تم حیرد سے شادی کر رہی ہو۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے مصنوعی حیرت سے بولا۔ پیشفہ نے فقط مسکرانے پر اکتفا

کیا تھا۔

”ایک وقت تھا جب تم دونوں ایک دوسرا کی جان کے دریے ہوا کرتے تھے اور وہ وقت تو میدے سامنے ہی گزرا ہے۔“ - جب سے ان کی شادی کی ڈیٹ فکس ہوئی تھی۔ راحم تب سے ہی حیرتوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب اسے کون سمجھاتا کہ محبت چاہے تو کیا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

کمال بدادرز کے ساتھ پچھلے جتنے کانتیڈیکٹس سائنس ہوئے ہیں، وہ سب ہی ماشاء اللہ سے کافی کامیاب رہے ہیں۔ لیکن اس بار جو اس کمپنی نے ڈیمانڈ رکھی ہیں۔ وہ میدے لیے تو ناقابل قبول ہیں۔ تیردا کیا خیال ہے؟“ سب سے الگ تھلگ وہ دونوں ڈرائینگ روم میں موجود تھے۔ جہاں ریاضت لیپٹاپ پر سر جھکائے کہتا کہ نائپنگ میں مصروف تھا، وہیں وہ بھی کچھ فائلیں اپنے سامنے رکھے بیٹھا ان کا مطالعہ کر رہا تھا۔

”ایک دو پوانٹس سے تو مجھے بھی اختلاف ہے۔ جس ریٹ پر پہلے کام ہوا تھا۔ اس بار انہیں پورے دس فیصد اضافی پر چاہئے۔ جو کے ہم فلحال افورڈ نہیں کر سکتے۔“ ٹھیک ہے پھر ان سے ڈیل کینسل کر کے ولی سنڈ کو اوکے کر دینا۔“ فائلز کو ٹیبل پر اچھال کر اس نے ساتھ ہی کلاشی

پر بندھی گھٹی پر بھی نظر ڈالی تھی۔

وہ دونوں اس وقت حیدر کے گھر پر ہی تھے۔ جہاں باہر مایوں کی رسم جاری تھی۔ لیکن وہ دونوں اندر بیٹھے تھے بقول حیدر کہ، پر جگہ ہی اپنا آفس کھول کر بیٹھ جاتے تھے۔ احمد کی تو دروازے کی جانب پشت تھی۔ لیکن ریاض باخوبی دیکھ سکتا تھا کہ وہ لوگ مسکدابٹ دبائے، دبے پاؤں وہاں داخل ہو رہے تھے۔

ویسے تو وہ پر وقت ہی سنجدہ نظر آتا تھا لیکن آج تو ریاض کو اس کا موڈ بھی کچھ ڈاؤن سالگ رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ کنکھیوں سے انھیں باز رہنے کی تلقین کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی حیدر نے ابٹن سے بھرے دونوں ہاتھ احمد کے چہرے پر رگڑ دیے تھے۔ اور سیکنڈ سے بھی پہلے وہ جھپٹاک سے باہر بھاگا تھا۔

ریاض سن بیٹھا اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ جو لمب بھینچے فوراً وہاں سے اٹھا تھا۔ پہلے جیکٹ اتار کد صوف پر پھینکی۔ پھر آستینیوں کے کف پلتے ہوئے دروازے کے جانب قدم بڑھا دیے۔ ریاض بھی اس کے پیچھے ہی باہر لگا تھا۔ آخر کو حیدر میں درگت ہنتے، وہ لائیو دیکھنا چاہتا تھا۔

شو روم سے وہ سیدھا وہاں پہنچا تھا۔ جب جارہانہ انداز

سے احمد کو ڈرائیور سے نکلتے دیکھا تو پہلے اسے پہچاننے میں ہی اس کو وقت لگا تھا کہ آیا وہ سچ میں احمد ہے کہ جس کا چہرہ ابٹن سے بھدا ہوا ہے؟ لیکن احمد کو تو ابٹن سے سخت الرجی تھی۔ پھر جانتے بوجھتے یہ حرکت کی کس نے تھی؟

اور یہ تو احمد کو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ حرکت کد کون سکتا ہے؟ اس کے غصے کی وجہ سے وہ لوگ اسے زیادہ چھپتے بھی نہیں تھے۔ صرف ایک حارث تھا جسے وہ کچھ نہیں کہا کرتا تھا۔ احمد کا پہلا شک اس پر گیا تھا۔ ورنہ باقیوں سے تو اسے بلکل امید نہیں تھی۔ وہ لاونچ میں آیا تو وہاں ساری لڑکیوں اور خواتین کے ندرے میں بیٹھے حیدر نے بے ساختہ امدادی مسکراہٹ کو مشکل سے چھپایا تھا۔

"احمد" کچن سے ابٹن کی تھاں لے کر نکلتی زر نور نے حیدر سے اس کا حلیہ دیکھا۔

تمہیں ابٹن کس نے لگا دیا؟" اس نے دوپٹے کے پلو سے اس کے بھیگے گال صاف کرتے ہوئے حیدرانگی سے پوچھا۔ یہ دو مجرے۔ "احمد نے اس کی تھاں میں رکھے کٹوروں میں سے ابٹن دونوں ہاتھوں میں بھدا تھا۔

جب تک حارث بھی وہاں آ چکا تھا۔ احمد نے پیچھے مڑ کر وہ دونوں ہاتھ حارث کے چہرے پر رکڑ دیے تھے۔ جو اپنی

جگہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ حیدر، تیمور اور ریاض پر ہنسی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ کیونکہ صرف وہی لوگ حقیقت جانتے تھے۔
”محضے کیوں لگایا؟“

”کیونکہ تو نے محضے لگایا تھا۔“

میں نے کب لگایا؟ میں تو آیا ہی ابھی ہوں“ - وہ دونوں حیدان پریشان سے گفتگو کر رہے تھے۔ جبکہ پیلے کپڑے اور پھولوں سے سچے تخت پر بیٹھے وہ لوگ ہنس ہنس کر پاگل ہوئے جا رہے تھے۔

”یہ ان لوگوں کی کارستانی ہے اور تو نے فضول میں میرا حال بگاڑ دیا۔“ حارت نے اپنی شرط کا حال دیکھا تو ناراضنگی سے کہا۔

اور پھر حمزہ مینشن کے در و دیوار حیدر کی چیخوں سے گونج رہے تھے۔ کیونکہ وہ پورے گھر میں احمد سے بچنے کے لئے بھاگتا پھر رہا تھا۔ ساری خواتین ضبط کیے بیٹھی تھیں۔ انھیں رسم کرتی تھیں۔ لیکن دولہا اپنے دوستوں سے بچنے کے لیے پورے گھر میں اودھم مچائے ہوئے تھا۔ لاونچ سے لان، لان سے لاونچ، وہاں سے دوسرے پورشن، دوسرے سے تیسرا پورشن، وہاں سے چھت۔ وہ تینوں بھی احمد کا پورا پورا ساتھ دیتے ہوئے آخر کار حیدر کو پکڑنے میں کامیاب ہوئی گے

”اسے قیدی کی طرح اچھی طرح سے قابو کر کے وہ

لوگ گرفت میں لیے، لاونچ میں لے ہی آئے تھے۔

معذز خواتینوں! ابٹن کی رسم ہم کر لیں گے آپ لوگ
مہربانی کر کے سائیڈ پر تشریف لے جائیں۔ ”وہاں جو
بھوپال آئے والا تھا، اس کے پیش نظر تیمور نے پہلے ہی
علاقہ کلٹری کرواتے ہوئے لیڈیز کو وہاں سے ہٹا دیا تھا۔
اب سین کچھ ایسا تھا کہ حیدر کو ریاض اور تیمور مصبوطی
سے تخت پر بٹھائے ہوئے تھے۔ جبکہ احمد اور حارث کچن
سے ہلدی کا پورا ڈبہ اڑھا لائے تھے۔ اب کثیر تعداد میں
ابٹن گھولتے ہوئے وہ ساتھ ہی ساتھ حیدر کو صلواتیں بھی
سنائے جا رہے تھے کہ جس کی وجہ سے ان دونوں کو دوبارہ
سے چینچ کرنا تھا۔

”شادی ہو رہی ہے ایم این اے کے بیٹے کی۔ احمد نے
مسکراتے ہوئے ابٹن کا پورا کٹورا اس کے چہرے پر مل دیا
تھا۔

خوشی تو بہت ہو رہی ہو گی۔“ اب کہ اس کے بالوں کو
کپڑوں کو، گردن کو ہلدی سے بھگو دیا گیا تھا۔ اس کی
حالت ایسی تھی کہ صرف آنکھیں ابٹن سے بھی ہوئی
ترھیں ورنہ تو وہ سر سے پید تک ابٹن میں بھیگا ہوا تھا۔
ریاض اور تیمور نے مسکراہٹ دباتے ہوئے آنکھوں ہی
آنکھوں میں ایک دوسرا کو احمد سے غداری کا پیغام دیا
تھا۔ اور جیسے ہی ان دونوں نے حیدر پر سے گرفت ہلکی

کی، وہ جوہٹکے سے اڑھ کد احمد کو زور سے گلے لگا گیا
ترہا۔

"احمد میدے بھائی!"

حیدر! بے غیدت! چھوڑ مجھے" - وہ اس سے جان چھڈانے
کے لیے سخت سخت سنا رہا تھا لیکن وہ اس کی جان
چھوڑنے کے بجائے ہنستے ہوئے مزید اسے خود میں
بھینچے جا رہا تھا۔

رات کے سارے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ خواتین اسے
زبردستی بٹھائے جانے کون کون سی رسمیں کد رہی تھیں -
دوستوں سے جان چروائی تو انہوں نے پکڑ لیا۔ جبکہ وہ سب
ابھی تک اپنے سے بھیگے لباس اور چہروں کے ساتھ ڈائنس
کے گرد بیٹھے ڈند کد رہے تھے۔
شو روم پر کام زیادہ ہونے کی وجہ سے اشعد بھی ابھی
وہاں آیا تھا۔

السلام عليکم بھائی!" لذکیوں کے پاس سے اڑھ کد وہ اس
کے پاس چلی آئی تھی۔

"وعليکم السلام کیسا ہے میدا بچہ؟" اشعد اسے ساتھ
لگائے محبت سے اس سے باتیں کد رہا تھا۔ جس کا نیلے
رنگ کے لباس میں چھدہ اور بھی کھلا کھلا لگ رہا تھا۔
"بھائی ہے اس کا" - ریاض کے تاثرات دیکھتے ہوئے تیمور

نے بیزاری سے ٹوکا تو وہ سد جھٹکتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھا کر لبou سے لگا گیا تھا۔ جانے کیسی شدت پسندی تھی اس کی۔ خود کے علاوہ کوئی دوسرا اس کے قریب برداشت ہی نہیں ہوتا تھا۔

حوالہ کد ! تیدی ہی ہے ”۔ حارث نے بھی شدارت سے ٹکڑا لگایا۔ کچھ ہی دید میں وہ بھی ان کے پاس ہی چلا آیا تھا۔

”بریانی کھائے گا یا کڈا ہی؟“ وہ چئید گھسیٹ کد بیٹھا تو تیمور نے لقمه چھاتے ہوئے پوچھا۔ کیونکہ ساری ڈشز اس کے سامنے ہی پڑی تھیں۔ سہولت سے منع کتے ہوئے وہ بھی اٹھا کد ریاض کی پلیٹ سے شروع ہو چکا تھا۔ میں کیا کہہ رہا تھا کہ تم لوگ مجرم سلامی تو دو گے ہی نا! تو ایسا کرو کہ سب ساتھ مل کد مجرم آسٹن مارٹن گفت کد دو۔“

وہ بھی ڈندر میں انھیں جوائن کتے ہوئے بولا۔

آسٹن مارٹن کا کیا کرسے گا؟ پیلسی کاپٹڈ خرد دین تھے؟“ حارث نے طنزہ مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”پیلسی کاپٹڈ کو میں کہاں اڑاتا پھر دوں گا؟ گاڑی ہی ٹھیک میں لے لے تو۔ اس نے شائگی سے انکار کیا۔-----

دنیا زمانے سے رشتے مٹائے ہیں --

تجھ سے ہی باری ہے ہماری، اک بار تو آ--
میں نے نبھایا ہے، کد کے دکھایا ہے --
لے تیدی باری، تو بھی پیار نبھا--

احمد کو خبدر ہی نہیں تھی کہ اس کے گھر سے اس کا گنگار
چدا کد اب وہ سب اپنے اپنے سنگنگ کے شوق کو جوش و
خدوش سے پورا کد رہے تھے۔

یہ ان ڈائیریکٹ آسٹن مارٹن کی ہی فرمائش کد رہا ہے۔
حیدر کے گانے کے بولوں پر تیمور نے نفی میں سد بلا کر
اسے ڈئیں کوڈ کد کے سب کے گوش گزار کیا تھا۔

بھائی! وہ تو تیدی اوقات سے بہت باہد کی چیز ہے ہاں!
لیکن مہدان صدور ہم تجھے دے سکتے ہیں۔ وہ بھی زیدو
میٹن۔

مہدان اپنے سد میں مار لو مجھے مارٹن ہی چائے۔ گانے
کے بولوں کی ہی طرح اس نے اس بات کو بھی گنگنا کد کہا
ترہا۔

وہ سب اپنی ہی خوش گپیوں میں مصروف تھے، جب اس
کے سیل کی رنگ ٹون بھی۔

گھر کب جائیں گے؟" اسکرین پر جگما تا پیغام اس کے
لبون پر مسکداہٹ دوڑا گیا تھا۔ وہ دوپہر سے وہاں تھی۔
جبکہ وہ محفل اور شور شرابوں کی عادی نہ تھی۔ تھوڑی
ہی دید میں وہ بیزار ہو جایا کرتی تھی۔

"کدھر؟ اس کو جوئے کے تسمے باندھتے دیکھ حیدر نے نا
سمجھی سے پوچھا۔

گھر جا رہا ہوں - اور گدھر جاؤں گا؟"

"لیکن آج تو سب کا یہیں رکنے کا ارادہ تھا - حیدر کی بات
پر وہ حیدران ہوا تھا۔

"یہ پلین کب بنائی؟" وہ حیرت سے ان سب کو دیکھنے لگا۔

"ہاں نا! ہمارا تو آج یہیں سونے کا پلین ہے" - حارث نے

حیدر کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے فوراً سے ڈرامہ گھڑا تھا۔

"سونے کا نہیں رکنے کا پلین ہے۔ صرف رکنے کا! اور اگر تو
سویا تو میں نے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر تیدے اوپر پھنک
دینی ہیں" - حیدر نے اسے گھوڑتے ہوئے وارنگ دی تھی۔

"تم لوگ رک جاؤ شوق سے - میں گھر جا رہا ہوں" - ٹیبل پر
سے والٹ اور چابی اٹھا کر اس نے بے نیازی سے کھا۔

"رک جا یار، ایک دن بعد میدی شادی ہو جائی ہے۔ پھر کہاں
کسی کا ملنا ملانا ہو گا۔ وہ لوگ جانتے بوجھتے اسے تنگ
کر رہے تھے۔

فاریہ کو گھر چھوڑ دوں۔ پھر واپس آجائوں گا۔ اس نے فقط
جان چڑائے کو کھا تھا کا کوئی ارادہ نہیں تھا واپس آئے کا۔
"فکر مت کر، فاری کو میں ڈراپ کر دوں گا۔ تو آرام سے رک

یہاں پر۔" اشعد بھی باخوبی ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

اُس اُوکے! میں خود بھی تھک گیا ہوں اس لیے بس گھر

ہی جاؤں گا۔

"شادی کے بعد سب ہی بدل جاتے ہیں بھئی .. حارت مصنوعی افسوس سے حیدر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ جو کینا طوز نظدوں سے ریاض کو دیکھ رہا تھا۔

"کل ملیں گے ناں!" وہ مسکراتے ہوئے سب سے ملنے کے بعد فاریہ کو ٹیکسٹ بھیج کر پورچ میں آگیا تھا۔ وہ تقدیربا پندرہ منٹ تک وہاں کھڑا رہا لیکن فاریہ کے آنے کے تو کوئی آثار ہی نہیں لگ رہے تھے۔ مجبوراً اسے دوبارہ اندر آنا پڑا تھا۔

تو گیا نہیں ابھی تک؟ "گٹار ابھی تک ان کے قبضے میں تھا۔ جو یقیناً اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ جب اسے واپس لاونچ ہیں آتے دیکھا تو تیمور نے حیدرانگی سے پوچھا۔ لیکن اس کی نظریں تو فاریہ کی ہی متلاشی تھیں۔ جو لائیہ اور اشعد کے ساتھ بیٹھی نظر آگئی تھی۔ گھرد نہیں چلنا؟" اس نے براہ راست اسے مخاطب کر کے پوچھا۔

سب یہی رک رہے ہیں۔ اس کا انداز دھیما اور کچھ بے بس سا تھا۔

یہ یہی رکے گی۔ تم جاؤ گھرد۔ تھک گئے تھے ناں؟ آرام سے جا کر سو جانا۔" زرنور نے اس کی کچھ دید پہلے کی کہیں بات سن لی تھی۔ اس کا حوالہ دے کر وہ شرارت

سے بولی۔

ہمیں معلوم ہے تجھے کس طرح سے قابو کیا جا سکتا ہے۔" اب تو رکے گا نا؟" وہ سب اب کا زیکارڈ لگانے لگے تھے۔ جنہیں لگا تھا کہ فاریہ کے وہاں رکنے سے وہ بھی اپنا ارادہ بدل دے گا۔

نهیں میں گھرد جا رہا ہوں"۔ اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

صبح لینے آجائوں گا تمہیں"۔ فاریہ سے کہنے کے بعد وہ سب کو اللہ حافظ کہتے باہر نکل آیا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اس نے گائی استارٹ ہی کی تھی کہ جب وہ بھی اندرونی عمارت کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی۔ وندو اسکرین سے وہ اسے حیرانگی سے دیکھ رہا تھا۔ جو چادر اوڑھے اور اپنا بیگ لیے، آ کر فرنٹ سیٹ کا ڈور کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

"تم نے تو آج میں رکھنا تھا؟" اس کے نا جانے کا سن کر جو اس کا موڈ خدا بوا تھا، اب اسے اپنے برابر میں بیٹھے دیکھ خود بخود خوش گوار ہو اٹھا تھا۔

میرا رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ سب تنگ کر رہے تھے آپ کو"۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان کی شدارت کا بتایا۔ ایک تو یہ ظالم دنیا! شادی ہو جانے کے بعد بھی جان نہیں چھوڑتی۔ "نفی میں سر ہلانا وہ اس کا ہاتھ تھامے

دوسرے ہاتھ سے ڈرائیونگ شروع کر چکا تھا۔

اس کشادہ اور سر سبز سی گلی کا یہ منظر تھا کہ جہاں کچھ دید پہلے کافی سارے بچے کرکٹ کھیلنے میں مگن تھے، وہ سارے اب گھروں کے ساتھ بنے اونچے چبوتروں پر شائقین بنے بیٹھے تھے۔ کیونکہ ان کے بیٹ اور بال پر اس وقت حارت اور حیدر کا قبضہ تھا۔ رات کو مہندی کی تقدیر تھی۔ جس کے سارے انتظامات دیکھنے کے بعد وہ لوگ باری باری حمذہ مینشن پہنچے تھے۔ جب ان بچوں کو گلی میں کھیلتے ہوئے دیکھا تو ان دونوں کے اندر کے کرکٹ بھی بیدار ہو گئے تھے۔ جن کی وجہ سے باقی سب کو بھی پہر گیم کا حصہ بتنا پڑا۔

حارت بیٹ پکڑے وکٹ پر موجود تھا جبکہ حیدر باولڈ کے فدائیں انجام دے رہا تھا۔ تیمور، ریاض اور اشعد فینڈ تک کد رہے تھے اور احمد اللہ پی کیپ پہنے حیدر کے پاس کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ ان لوگوں نے اسے زبردستی امپائیڈ بنا رکھا تھا۔

جبھی دور سے بھاگتے ہوئے آگر حیدر نے اسے بال ڈالی تھی، جو شاٹ مارنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ لیکن اتنا زبردست شرٹ کھیلنے کے بعد بھی اس کی ہال سیدھی ریاض کے ہاتھوں میں گدی تھی۔ تمام بچوں نے ”آؤٹ،

آؤٹ" کا شور مچا کد پوری گلی سد پر اڑھا لی تھی۔ ان لوگوں کی بھی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔
"اب میدی باری ہے"۔ آؤٹ کرنے کے بعد وہ فخد سے کالر کھٹے کرتا اب بیٹنگ پر زور آزمائی کرنے والا تھا، جب ہی احمد کی بات پر غصے کے گھونٹ بھر کر رہ گیا تھا۔ جس نے ہاتھ اڑھا کر نو بال کا اشارہ دے دیا تھا۔ تین بار ایسا ہو چکا تھا۔

حارت کے بد آؤٹ پر وہ نو بال کا اشارہ دے کر ان کی صلوواتیں سن رہا تھا۔

امپائر صاحب آپ بہت غلط کر رہے ہیں۔ بال زمین کو چھوٹ بفید سیدھی میدے ہاتھوں میں گردی ہے۔ جو کہ صاف آؤٹ ہے۔ "ریاض اپنا بھرپور احتجاج ریکارڈ کرو رہا تھا۔

امپائر کبھی غلط نہیں ہوتا۔ ناؤ بیک ٹو دا گیم۔ "پی کیپ کو ٹھیک کرتے ہوئے اس نے لا پرواہی سے کہا۔
"بہت بڑی غلطی کر دی اس کو امپائر بنा کر۔ یا تو اس کا امپائر نہیں بنانا تھا یا پھر اس منحوس حارت کو بیٹنگ پر نہیں بھیجننا تھا۔ وہ سب ہی اپنے فیصلے پر پچتا رہے۔ جبکہ وہ ہنستے ہوئے دوبارہ شاٹ مارنے کے لئے ریڈی تھا۔

سات رنگوں کی تھیم سے سچے پنڈال میں صحیح معنوں
میں رنگوں کی بھاریں اندی ہوئی تھیں - ہر سو پھولوں اور
مہندی کی خوشبو کا راج تھا۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ
بھی جاری تھا۔ بڑے سے استیج پر پھولوں سے سچے
منقش جھولے پر وہ تقدیبا نیم دراز ہوا بیٹھا تھا۔

بلیک پینٹ پر ریڈ کلد کی ہڈی پہنے، آنکھوں پر گاگلز
چڑھائے، پیشائی پر بکھرے بالوں کے ساتھ وہ اس حلیے
میں دولہا تو دور کی بات، اس مہندی کے فنکشن کا مہمان
بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ اس کی ہڈی کے
سامنے طرف "میں ہوں دولہا حمذہ حیدر علی" گولڈن رنگ
میں لکھا ہوا تھا۔ ورنہ تو کسی نے یقین بھی نہیں کرنا تھا۔

"یہ ہڈی پر لکھوائے کی کیا تک بنتی ہے آخر؟ شکل پر
ہی لکھوا لیتے۔" زرنور کا انداز تیکھا تھا۔ وہ ابھی تک
حیدر کو اپنا ہمسائیہ قبول نہیں کر پائی تھی۔

"تم لکھ دو۔" وہ دلنشیں انداز میں شوخی سے بولا۔

حیدر کی والدہ اس کے ہاتھوں پر رکھے مہندی کے پتے پر
مہندی لگائے ہوئے ابھی بھی اس کے لباس پر سرزنش
کیسے جا رہی تھیں کہ کم از کم ڈھنگ کے کپڑے تو پہن کر
آتا۔ آخر کو وہ دولہا ہے۔

ویسے تو مہندی کا فنکشن کمبائن رکھا گیا تھا۔ لڑکے والے
کب کے پہنچ گئے تھے۔ لیکن لڑکی والوں کا کہیں آتا پتا

کوئی ساڑھے گیارہ بجے جا کر شور اٹھا تھا کہ لڑکی والے پہنچ گئے ہیں۔ بال کے انڈس پد تو مانو کوئی طوفان اٹھ آیا تھا۔ شور ایسا تھا جیسے کتنی بھی بائیکس ایک ساتھ ریس دے رہی ہوں۔ وہ استیج اور فلور کو جوڑے ہوئے دو استیپس میں سے اوپر والے پر بیٹھا تھا۔

وہ جو کب سے اپنی شیدرنی کی آمد کا منتظر تھا۔ بالآخر وہ انتظار ختم تو ہوا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یشافہ پیور مشدوقی روپ میں آج کیسی لگنے والی ہے۔ مہندی، چوڑیاں، لہنگا، دوپٹہ۔ آج تو وہ یقیناً اس کی دل پر چھڑیاں بھی چلا دے گی۔

ایک کے بعد ایک، پھر ساتھ ساتھ چلتی وہ دس بارہ بیوی بائیکس ایک ساتھ وہاں آ کر رکھی تھیں۔ جہاں ایک دم دھوکا دھوکا سا پھیل گیا تھا۔ سارے بھی سوار بقید ہیلمٹ کے تھے۔ سب سے آنے والے کے علاوہ۔

جس نے بھی بلیک پینٹ پر ریڈ کلد کی ہڈی پہن رکھی تھی۔ ہیلز کے بجائے اس کے پیر ریڈ جاگرد میں مقید تھے۔ ہیلمٹ اتار کر اس نے سد کو دائیں بائیں جھٹکا دیا تو استدیٹ بداون لمبے بال کمپ پر جھوول گئے تھے۔ اس کی بدی پر بھی ”میں ہوں دلہن یشہ حیدر“ لکھا تھا۔ جس کی

بائیک کے پیچے حیدر کے پانچوں دوست اپنی اپنی بائیکوں
پر سوار تھے۔

اپنے دوستوں کی بے وفائی پر وہ صبر کے گھونٹ بھرنے
کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔ جو اسے تو وہاں گوٹے کٹاری
سے سچے دوپٹے کی چھاؤں میں لائے تھے۔ اور یشفہ کے
لیے یہ اینٹدی؟ بس بہت ہو گیا۔

میں نہیں کھلی رہا! وہ منہ بنائے وہاں سے اڑھ کر خود ہی
جھولے پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔

"شدم نہیں آئی تمہیں میدی کاپی کرتے ہوئے؟ ہند کاپی
کیٹ!" یشفہ کو یونہی اس کے ساتھ لا کر اڑھا گیا اس نے
بھنا کر پوچھا۔

تم کیا اتنی سی بات پر مجھ سے لڑ رہے ہو؟ دیکھو کتنے
اچھے لگ رہے ہیں ہم ٹوئنگ کرتے ہوئے یشفہ نے بلکے
پھلکے سے انداز میں کہا تو وہ چاہتے ہوئے بھی اپنا
مصنوعی غصہ پر قدر نہیں رکھ پایا تھا۔ چوڑیوں کے نام پر
صرف تھوڑی سی ہدی چوڑیاں اس کی کلائی میں کھنک
رہی تھیں۔ جو ہڈی کی آستینوں میں ہی چھپ گئی تھیں۔
اور مہنڈی کے نام پر صرف ایک گول ٹکیہ ہی اس نے دونوں
ہاتھوں کی پشت پر لگا رکھی تھی۔

حیدر کی والدہ مہدین ظہور نے بہت سے کلر کنٹرول کا
کامدار دوپٹہ اس کے سر پر ڈالنے کے بعد اس کی پیشانی

کو چوما تھا -

ان کے بعد پھر سب باری باری رسم کے لئے آئے گئے
تھے۔

مجھے لگا تھا مہرین آنٹی صدور غصہ کر دیں گی کہ یشفہ
نے یہ کیا پہن رکھا ہے۔ لیکن لگتا ہے انہوں نے بھی صد
کر لیا ہے کہ ان کے دونوں بیٹے بھو ایک ہی جیسے پاگل
ہیں۔ لائبہ کے تاسف سے کہنے پر وہ دونوں ہی بڑا ماننے
کے بجائے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے تھے۔

ہال کے نیم اندر ہی تھیم کی بدولت سارا ماحول ہی
خواب ناک سا معلوم ہوتا تھا۔ بڑے سے ڈانس فلور پر یشفہ
کے سارے کزنز کا قبضہ تھا۔ جنہوں نے صرف تین دن کے
اندر اندر کئی گانوں پر پریکٹس کر کے خوب جان ماری
تھی۔

جتنا نیگ مانگوں گی اتنا ہی دینا پڑے گا اور خبردار جو تم
نے دامن بچایا تو ” زرنور اس کی چھوٹی انگلی پکڑے
دهونس سے بولی۔

آج میدی مہندی سے اس لیے میں تمہیں خوشی خوشی دے
رہا ہوں۔ وہ بھی خود سے ہی۔ حیدر نے والٹ سے دو لال
نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھا رہے تھے۔

چلو اب رکھ بھی لو۔ میں اتنا بھی کنجوس نہیں ہوں جتنا تم

لوگ مجھے سمجھتے ہو۔"

دو سو روپے؟" زر نور نے آبدو اڑھا کر اسے گھورا۔
زیادہ ہے نا؟ معلوم ہے مجھے لیکن میں دل کا بہت سخی
ہوں۔"

ان کا تم اپنا صدقہ دے دینا۔ وہ جلد کر بولی۔

وی تو دے رہا ہوں۔ - حیدر کے ایک دم سے قہقہے لگا کہ
کہنے پر زرنور کا دل چاہا تھا کہ وہ رکھ کر ایک تھہیٹ تو لگا
ہے دے اس کو۔ شدم تو آتی ہی نہیں تھی۔

حیدر شرافت سے پندرہ ہزار روپے دو۔ یہ رسم ہے۔ آج تو
تمہیں پیسے دینے ہی پڑیں گے۔" لائیہ اور مناہل بھی اب
اس کے پیچھے پڑ چکی تھیں۔

پندرہ ہزار؟" اس کی انکھیں حیرت سے پھیلی۔
میدے پاس اتنا کیش نہیں ہے بھئی۔" دونوں ہاتھ جھاڑ کر وہ
نفی میں سر ہلا کر بولا۔

چیک دے دو۔ انہوں نے بھی کہاں پیچھا چھوڑتا تھا۔

اب چیک کہاں سے لاؤں؟ کافی دید گزر جانے کے بعد بھی
حیدر پیسے دینے پر راضی نہ ہوا، تو پھر ریاض اور اشعد
ہی میدان میں آئے تھے۔

بھنوں میدی بات سنو!" جھولے کے قریب کرسی رکھ کر
بیٹھتے ہوئے ریاض نے ان تینوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔
فارہ اور انوشے وہاں نہیں تھیں۔

اگر تیس فیصد مجھے دینے کا وعدہ کرو تو ابھی کے ابھی
پورے پندرہ ہزار نکلوا کہ دون گا تمہیں۔ ریاض کی پیشکش پر
ان تینوں نے نظرتوں ہی نظرتوں میں تبادلہ خیال کیا تھا۔
تیس نہیں پچیس فیصد!" مناہل نے اپنی ڈیل سامنے رکھی
تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

ڈیل ہو گی تو صرف تیس فیصد پر ہی ہو گی۔ پندرہ فیصد
میدا، پندرہ اشعر کا۔

پندرہ ہزار کا تیس فیصد یعنی کہ ساڑھے چار ہزار! خیر اتنا
زیادہ بھی تمہیں تھا۔ زرنور کے لیے تو یہی بہت تھا کہ حیدر
کی جیب سے وہ پیسے نکلے گے۔ اب نکلنے کے بعد
بھلے کسی کے بھی پاس جائیں۔

اوکے ڈن!" ان تینوں نے باہمی مشاورت کے بعد ہاں کر دی
تھیں۔ اب وہ بس یہ دیکھنے کو پرجوش تھیں کہ ریاض اس
شیطان سے کیسے پیسے نکلواتا ہے۔

اب دیکھو میدا کمال" - کف پلٹتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
چوہدری! تو میدے ساتھ بے وفائی کرے گا؟ کیونکہ وہ ڈیل
حیدر اور یشفہ کے سامنے ہی طے پائی گئی تھی، اس
لیے وہ دونوں بھی اس سے واقف ہی تھے۔ حیدر نے دکھ
بھدے لہجے میں ریاض کو دیکھ کر کہا۔

جانی بزنس از بزنس۔ ارمان بھائی کہتے ہیں ایک روپیہ بھی
وہاں انویسٹ کرو جہاں سے دو روپے ملنے کے سو فیصد

چانسز ہوں۔ اور یہاں تو مجھے بغیر انویسٹمنٹ کے ہی

سازھے چار ہزار مل رہے ہیں۔ اور پھر غالب نے بھی کیا خوب کہا ہے کہ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟ ”ریاض نے اطمینان سے کہا تو وہ محظوظ اسے گھور کر رہ گیا۔

دیکھتا ہوں میں بھی، کیسے نکلواتا ہے تو مجھ سے پیسے

- اس نے چیلنجنگ انداز میں کہا تو ریاض ایسے مسکرا دیا

- جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔

اور پھر حیدر کی گنگار آنکھوں نے وہ منظر دیکھا تھا۔ جب اس کے برابر میں بیٹھی یشفہ نے اس کا پورا والٹ ہی نکال کر ریاض کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ حیدر کو خبیر بھی نہیں ہوئی کہ کب وہ اس نے نکالا۔

بھم! کیش تو زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اسے ٹھی ایم اور کریڈٹ

کارڈز صدور موجود ہیں۔ تم لوگوں کی تو عید ہو گئی۔ جاو

عیش کدو۔ ریاض نے والٹ چیک کرنے کے بعد لائیہ کی

جانب اچھا دیا تھا۔ جہاں وہ تینوں خوشگوار سی حیرت میں

گھردی خوش ہو رہی تھیں۔ وہیں حیدر خشمگین نظدوں سے

یشفہ کو گھور رہا تھا۔ جس نے سد پر اوڑھے دوپٹے کا

گھوگھنٹ سا نکال کر رخ موڑ لیا تھا۔

پورے ڈانس فلور پر لڑکیوں کا قبضہ تھا۔ جن کے درمیان میں

زرنور کھڑی تھی۔ تیز میوزک پر سب ایک جیسے ڈانس مووز

کد رہی تھیں۔ جبکہ نیمور، حارت اور ریاض، احمد کے سامنے کھڑے اسے زدنور کا ڈانس دیکھنے نہیں دے رہے۔ وہ بظاہر انجان بنا ہوا تھا لیکن زیر لب مسکراتے ہوئے انہیں سامنے سے بٹ جانے کے لئے سخت سست سننا رہا تھا۔ جو ہنستے ہوئے اس کی بڑی طرح کی کوشش ناکام بنا رہے تھے۔ کہنے کو حیدر دولہا تھا۔ لیکن پانچ منٹ بھی اس سے استیج پر ٹک کر بیٹھا نہیں گیا تھا۔ رسم ہوتے ہی وہ فوراً نیچے اتر کر اپنے دوستوں کے سنگ سنگ پہنچ رہا تھا۔ ابھی بھی وہ اشعد کے ساتھ انہیں جوانہ کر کے احمد کو اور بھی تنگ کرنے لگے تھے۔

"بٹ یا سامنے سے۔ تیڈی بھابھی کھٹی ہے۔"

جیسے ہی اسپیکرڈ میں وہ گانا بجا۔ ان لوگوں کے بھی قہقہے چھوٹے تھے۔ جو ان کی سچویشن پر پورا فٹ بیٹھ رہا تھا۔

ایک سائیڈ پر بوفے استینلیڈ پر انواع و اقسام کی کافی ساری ڈشز چنی ہوئی تھیں۔ بھاپ اڑاتا گدم گدم کھانا سب کی ہی بھوک جگا گیا تھا۔ سب ہی اپنی پلیٹ پکڑے من پسند چیزوں سے لطف انداز ہو رہے تھے۔

سبز اور سرخ امتزاج کی انار کلی فرماک پہنے۔ سارے بالوں کو کرلز کر کے دائیں کندھے پر ڈالے وہ بھی پلیٹ میں

منچورین اور رائیس ڈالے کھانے میں مصروف تھیں۔ اس کے ساتھ مناہل اور انوشے بھی وہیں کھڑی تھیں۔ بیٹھنے کے لیے ایک گرسی بھی خالی نہیں ملی تھی۔
لگنا تھا جیسے مہندی میں پورے آدھے شہر کو مدعو کر رکھا تھا۔

"اکیلے اکیلے؟" انتظامات دیکھتے ہوئے وہ جب اس جانب آیا تو زر نور کو کھانا کھاتے دیکھ مصنوعی ناراضگی سے دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے چاول سے چمچ بھرد کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

"مجھ پر اتنی مہربانی؟" احمد نے آبدو سکیٹ کر اس کے مہندی سے رچے ہاتھ میں تھامے چمچ کو دیکھا۔ پھر استحقاق سے اس کا ہاتھ پکڑ کر چمچ منہ میں ڈال لیا تھا۔
شام سویں اب میں جورو جورو کھوں گا۔
میں جورو کا غلام بن کے رہوں گا۔

ان دونوں کو ایک ہی پلیٹ سے کھانا کھاتے دیکھ حیدر اور ریاض فل تان میں سر لگا رہے تھے۔ باقی سب بھی ان کا ساتھ دیتے ہوئے اتنی ہوٹنگ کر رہے تھے کہ زر نور سے کھانا کھانا دو بھرد ہو گیا۔

جورو کے لئے ہر ستم اب سہوں گا۔

میں جورو کا غلام بن کے رہوں گا۔

احمد نے کانچ کا پانی سے بھرا گلاس اس کی جانب بڑھایا

تو پھر وہ لوگ شروع ہو چکے تھے۔ اتنا تو وہ لوگ شادی سے پہلے انہیں تک نہیں کرتے تھے۔ جتنا شادی کے بعد ان کا ریکارڈ لگایا کرتے تھے۔

اے شوہد سے میدا۔ تم لوگ کیا ہد وقت شروع ہو جاتے ہو۔
چھے پر سرخی لیے زنور نے ان دونوں کو آنکھیں دکھائیں۔

اے شوہد سے میدا۔” اس کے لفظ کپڑ کر وہ لوگ نور نور سے قہقہے لگا رہے تھے۔

زنور نے ناراضنگی سے احمد کو دیکھا کہ وہ ان دونوں کو کچھ کہہ کیوں نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ تو رشین سیلیڈ کھاتا، مسکراتے ہوئے انہیں انجوئے کر رہا تھا۔

اتنے اہتمام سے تیاری کرنے کے بعد ہی کچھ چیزیں تھیں جو حیدر کو خریدنی تھیں۔ اشعد اور حارث شو روم کے کام میں کچھ مصروف تھے۔ احمد کو بھی دو تین میٹنگز اٹینڈ کرنی تھیں۔ اور تیمور نے تو کوئی بہانہ کیے بغیر ہی جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اب لے دے کر ایک ریاضت ہی بچا تھا۔ جسے وہ زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ مال لایا تھا۔ اسے شیدوانی کے ساتھ ایک ویلوٹ کی شال لینی تھی۔ جو چار گھنٹے تک مختلف مالز اور ڈیزاينر شاپس پر جا کر کافی مشکل سے وہ لینے میں کامیاب ہو پایا تھا۔

واپسی میں تو انہیں کافی رات ہو گئی تھی۔ حمزہ مینشن
میں ڈنڈ پارٹی کا اہتمام تھا۔ تقریباً سارے ہی مہمان پہنچ
بھی گئے تھے۔

وہ دونوں بھی گھر کے لیے نکل چکے تھے۔
اب اگر کل تونے مجھے کہا کہ فلاں چیز خریدنی ہے۔ فلاں
چیز رہ گئی ہے، تو میں سچ بتا رہا ہوں بہت برا ماروں گا
تجھے۔

ریش ڈرائیونگ کرتے ریاض نے اسے گھور کر کہا۔ جس کی
شاپنگ ہی ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔
”جانی! بس یہ آخری چیز تھی قسم سے۔ لیکن اگر بعد
میں کچھ یاد آیا تو، فکر مت کر میں سب سے پہلے تیرے
پاس ہی آؤں گا ساتھ لے جانے کے لئے۔ حیدر نے مطمئن
سے انداز میں کہا تو وہ اسے سخت سوت سنانے کو صرف
ہکا سا ہی اس کی جانب مٹا تھا۔ لیکن صرف ایک لمحے
کی ہی بات تھی۔ جب ون وے روڈ کی وجہ سے سامنے
سے اچانک آئے ٹڈک کو وہ دیکھ نہیں پایا تھا۔

”ریاض!“ حیدر بوکھلا کر اسے گاڑی سائیڈ پر کرنے کے
لئے چیخا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی ان کی گاڑی اس
سے ٹکدا چکی تھی۔

ایک زور کے تصادم کے باعث بلند سا شور فضاء میں ارتعاش
سا مچا گیا تھا۔ پیچھے آنے والی کئی گاڑیوں نے ایک ساتھ

بڑیک لگائے تھے۔ بیچ روڈ سے دھوئیں کے مرغولے اٹھتے
آسمان میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔

مہندی اور بارات کے بیچ میں ایک دن کا گیپ تھا۔ جس کا
فائہد اٹھاتے ہوئے ظہور دلاور نے ایک پر تکلف سی دعوت کا
اهتمام کر رکھا تھا۔

جس میں زیادہ تر مہمان ان کے سیاسی دوست ہی تھے۔
ساری ارینجمنٹ بھی کشادہ سے لان میں کم گئی تھی۔
ڈنڈ شروع ہو چکا تھا لیکن ریاضی اور حیدر کا کہیں کوئی اتا
پتا ہی نہیں تھا۔

”اس لڑکے کو بھی عین وقت پر ہی سارے کام کرنے ہوتے
ہیں۔ بیٹا آپ حیدر کا نمبر تو تداٹ کر میں۔ دوپہر سے نکلے
ہوئے ہیں وہ دونوں۔ ”مہرین ظہور پریشانی سے تیمور سے
کہہ رہی تھیں۔

ان کے کہنے سے پہلے ہی وہ سب کئی بار اپنے اپنے
فونز سے ان کے نمبر ڈائل کر چکے تھے۔ جنہوں نے ایک
گھنٹے پہلے کہا

ترہا کہ بس پہنچ رہے ہیں۔ لیکن اب تو دونوں میں سے کسی
کا فون بھی میں نہیں لگ رہا تھا۔

وہ سب بڑی سی ٹیبل کے اطراف میں ہی بیٹھے تھے،

جب حارث کے فون پر ان نوں نمبر سے رنگ ہوئی۔ سب کی نظریں اسی پر تھیں جس نے گرین بٹن سلائیڈ کر کے فون کان سے لگایا تھا۔

"حیدر! کہاں پر ہو تم لوگ؟ گھر کیوں نہیں پہنچے ابھی تک؟" اس کی آواز سنتے ہی وہ جلدی سے بولا۔
کیا بکواس کر رہا ہے؟ دوسرا جانب سے جانے کیا اسے سنتے کو ملا تھا جو اسے ساکت کر گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے حارث؟"

"حارث کچھ بتا تو صحیح! وہ سب پریشانی سے اس سے دریافت کر رہے تھے۔

"کیا کہا حیدر نے؟ کہاں ہیں وہ دونوں؟" احمد نے حارث کو دونوں کندهوں سے تھام کر سختی سے پوچھا۔
اس نے کہا-- اس نے کہا کہ--

ایکسیڈنٹ--- ہو گیا تھا۔ خالی خالی نظروں سے وہ احمد کو دیکھتے ہوئے بولا۔" ایکسیڈنٹ؟"
"ریاض--"

"کیا ہوا ریاض کو؟"

"اس نے کہا کہ-- ریاض کی ڈیتھ ہو گئی--"
زمین ہی کھینچ لے گئے تھے۔

ریاض نہیں رہا احمد - - "ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے ادا ہوئے وہ الفاظ ، وہاں موجود بد شخص کے پیدوں کے نیچے

اس کا گلابی چھرہ اتنا سفید پڑ چکا تھا کہ مانو جسم سے
سارا خون ہی نچڑ گیا ہو۔ اشعد کے گلے لگی وہ ہچکیوں
سے بڑی طرح رو رہی تھی۔ جس کی خود کی حالت اس
سے مختلف نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی خود پر انتہا کا ضبط
کیے وہ اسے سنبھالنے کی سر تور کوشش کر رہا تھا۔ جس
نے رو رو کد حشر خداب کر رکھا تھا۔

صرف دو ہفتے ہی تو گزرے تھے ان کی شادی کو۔ اسے رہ
رہ کد اس کا چھرہ اپنی نگاہوں کے سامنے نظر آ رہا تھا۔
صرف کچھ دنوں میں ہی وہ اسے اپنا ایسا عادی بنا گیا تھا
کہ اس کے بغیر زندگی گزارنا ہی سوحان روح لگتا تھا۔

تمہیں معلوم ہے کہ جب مجھے تم سے محبت ہوئی تھی
تو میں کیا دعا کیا کرتا تھا؟ وہ اس کے بازو پر سر رکھے
بیٹھی تھی

جب اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے ریاض نے اچانک
ہی کہا۔

کہ بس ایک بار تم مجھے حاصل ہو جاؤ۔ میں تمہیں اپنا حال
دل سنادوں۔ اس کے بعد میں مد بھی گیا تو مجھے اس کا
افسوس نہیں ہو گا۔"

"شادی کے صرف کچھ دن بعد ہی مرنے مارنے کی باتیں

کون کرتا ہے؟" فاریہ نے دہل کے اسے ناراضنگی سے دیکھا۔

"یہ اس وقت کی بات ہے جب تم مجھے میسر نہیں تھیں لیکن تمہیں پانے کے بعد تو مجھے مدنے سے کافی خوف آئے لگا ہے۔ فاریہ کی آنکھوں سے شدت سے آنسو روان تھے۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

چپ ہو جاؤ فاریہ! پاگل ہو جاؤ گی تم۔ آنسو تو لاثیہ کی آنکھوں سے بھی روان تھے۔ لیکن فاریہ کی حالت اتنی قابل رحم تھی کہ کوئی چاہ کد بھی اپنے اشکوں پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔

گاڑی سے نکل کر وہ بھاگتے ہوئے پاسپیڈل کی اندرونی عمارت میں داخل ہوئے تھے۔ ریسیپیشنسٹ سے پتا کرد کے جیسے ہی چوتھے فلور پر پہنچے، سامنے ہی کھڑے حیدر پر ان کی نظر پڑی تھی۔ جس کی سفید شرٹ خون کے دھبوں سے داغدار ہوئی وی تھی۔

احمد تو اسے نظر انداز کرتے ہوئے روم سے نکلتے ڈاکٹر کی جانب بڑھا تھا۔

جبکہ حارث، اشعد اور تیمور نے رکھ کر دو تین تھیڈ اس کو لگائے تھے۔

یار! مجھے کیوں مار دے ہو؟" دونوں ہاتھ آگے کیے خود کو

بچانے کی کوشش میں اس نے حیدانگی سے کہا۔

"تو نے فون پر کہا تھا کہ ریاض کی دیتھ ہو گئی ہے؟"
حارت نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

"ہا ہو۔۔۔ وہ مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اس نے سر کھجھاتے ہوئے خفیف سے انداز میں کہا۔

"اچانک سے وہ سب ہوا تو میں بوکھلا گیا تھا۔ اور پھر میں نے اسے چیک کیا تھا۔ وہ سائنس ہی نہیں لے رہا تھا۔
مجھے لگا۔۔۔

ہو گیا اس کا تو کام تمام۔۔۔ لیکن وہ تو یہاں آ کر معلوم ہوا کہ صرف بے ہوش ہوا تھا۔

تیری اس غلط فہمی کی وجہ سے تجھے معلوم ہے کتنوں کو ہارت اٹیک آسکتا تھا؟" اشعر کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا گلاہیں دبا دے۔ فاریہ کی حالت تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا۔ اگر تو وہ خبود سچ ہوتی تو وہ کیسے سنبرہاں پاتا اسے ساری زندگی؟

وہ بیڈ پر نیم دراز تھا۔ پیشانی اور بازو پر سفید پٹی بندھی تھی۔ پدائیویٹ روم میں اسے شفت کر دیا گیا تھا۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے اسے گھرد جانے کی بھی اجازت دے دی تھی۔ اسے صحیح سلامت اور سب سے بڑھ کر زندہ دینے کے بعد تو جیسے ایک نئی زندگی کی لہد ان کے اندر دوڑ

گئی تھی۔ ان کی دوستی کو اتنے سال گزر گئے تھے۔ ایک گھردا اٹھت رشتہ ان کے دلوں کو آپس میں اس طرح سے جوڑے ہوا تھا کہ کسی ایک کو بھی کوئی تکلیف پہنچتی تھی تو باقیوں پر بھی اس کا اثر پوری شدت سے پڑتا تھا۔ انہیں ایک دوسرا کے ساتھ کی اتنی عادت تھی کہ کبھی خواب میں یا مذاق میں بھی وہ ایک دوسرا سے بچھڈنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

احمد ان کے گروپ میں سب سے آخر میں شامل ہوا تھا۔ جن کے ساتھ اسے فقط تین چار سال ہی ہوئے تھے۔ لیکن پہر بھی اپنے ان پانچ دوستوں میں اس کی جان بستی تھی۔ صرف انہی کی وجہ سے وہ واپس اٹھی نہیں گیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے وہیں رہ گیا تھا۔

”معلوم ہے مجھے! غلطی تمہاری ہد گز نہیں ہو گی۔ بلکہ سامنے والا ہی پاگل ہو گا جس نے اپنا ٹرک تمہاری گاڑی سے دے مارا ہو گا۔“ چھ نفوس کی موجودگی میں صرف احمد کی غصیلی آواز وہاں گونج رہی تھی۔

ہد چھوٹے موٹے ایکسیڈنٹ کے بعد ان کا یہی ایک بہانہ تو ہوتا تھا کہ ہم نے کچھ نہیں کیا بلکہ دوسرا گاڑی ہم سے ٹکدائی ہے۔ اور اس میں کوئی جھوٹ بھی نہیں تھا۔

ہمیشہ ہی یہی ہوتا تھا ان بے چاروں کے ساتھ۔ لیکن احمد اس بار ان کی سنبھال کے موڑ میں ہد گز نہیں تھا۔

وہ بہت کم ان پر غصہ کیا کرتا تھا۔ لیکن جب کرتا تو اگلی پچھلی ساری کسہ ہی ایک دفعہ میں نکل جاتی تھی۔ وہ جو اپنے سگے بھائیوں کی ڈانٹ خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن اس کی چپ چاپ سن لیا کرتے تھے۔ وہ تھا بھی تو ان سب سے دو سال بڑا۔ جس کا وہ بعض دفعہ فائدہ بھی خوب لٹھایا کرتا تھا۔

رباب اور ہاشم چوہدری ایک عزیز کی شادی میں شرکت کے لئے لاہور گئے ہوئے تھے۔ انہیں تو اس واقعے کی خبر بھی نہیں دی گئی تھی۔ چوہدری میشن نیم انڈھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ آج تو وہاں کی لائنس بھی روشن نہیں کی گئی تھیں۔ صرف پورچ اور لاونچ کی ایک دو لائنس جلد رہی تھیں۔ لائبہ اس کے ساتھ وہیں رکی ہوئی تھی۔ جو کافی دیر تک اسے خاموش کرائے کے کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی دلجوئی کرتی رہی تھی۔ لیکن صبر تھا کہ اسے آتا ہی نہیں تھا۔ پاسپیٹ میں ریاض کے زندہ ہونے کی خبر سننے کے بعد وہ لوگ خوشی میں کسی کو بتانا ہی یکسر فراموش کر چکے تھے۔ وہ تو حارت نے یاد آئے پر گھر فون کر کے سب کو بتا دیا تھا۔ لیکن لائبہ اور فاریہ سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہو پایا تھا۔ ان دونوں کو اپنے فون کا ہوش ہی نہیں تھا کہ کدھر پڑے ہیں۔

لائیب اسے لاونج میں ہی چھوڑ کر نماز پڑھنے کے لئے
اٹھی تھی۔ وہ جو گھٹنیوں میں سر دیے بیٹھی۔ اس کی
ذات میں کھوئی تھی۔ ایک جھٹکے کی آواز پر چونک کہ سر
اٹھایا تھا۔ نیم اندر ہی کے باعث بھی وہ اسے پہچان
گئی تھی جو لاونج کا دروازہ دکھیل کر اندر داخل ہوا تھا۔ ایک
چیخ اس کے لبوں سے بددآمد ہوئی تھی۔ وہ لبوں پر ہاتھ
رکھے، پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی
تھی۔

"کیا ہوا؟" ریاض نے اسے اس طرح سے خود دیکھتے پایا
تو ناسمجھی اور حیدرانگی سے کہا۔
"آپ تو۔۔ آپ تو مد گئے تھے۔"

میں مد گیا تھا؟ "سفید چہرہ، پر نم آنکھیں، سرخ ناک،
کندھے پر جھولتا دوپٹہ۔ اس کا یہ بے پرواہ اور بکھرا حلیہ
ریاض کو حیرتوں میں مبتلا کر گیا تھا کہ صرف اس کے ایک
چھوٹے سے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے فاریہ نے یہ کیا حالت
کدلی تھی اپنی؟

لیکن اس کی بڑبڑا ہٹ پر اس نے بے ساختہ حیدر کو کوسا
تھا۔ اس حیدر کے بچے نے تو اسے جیتے جیسی ہی مار دیا
تھا۔

میں بالکل ٹھیک ہوں فاریہ۔ وہ سب بس ایک میں
انڈرسٹینڈنگ کی وجہ سے ہوا تھا۔ "ریاض نے اس کا چہرہ

پا تھوں میں بھر کر نہیں سے کہا تو وہ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر اس کے گلے لگی پھر سے رونا شروع ہو چکی تھی۔

"مجھے لگا میں -- آپ کو -- کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی -- میں ڈر گئی تھی -- بہت زیادہ" -- اس کی شدث کو مٹھیوں میں بھینچے وہ شدت سے رو رہی تھی۔

کیا وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا؟ آج پہلی بار اس کا زو معنی سا اعتراف محبت ریاض کے سلگتے دل پر برسات بن کر پڑا تھا۔

جس کی جلتی ہوندیں اس کے وجود کو بے خود کیے دے رہی تھیں۔ اس دن کا تو اس نے برسوں انتظار کیا تھا۔ کہ کب اس کے لبوں سے وہ اپنا ذکر سنے گا۔

لائبہ کی بے ساختہ چیخ پر وہ دونوں ہی ہڈیا اڑے تھے۔ "تم زندہ ہو؟" وہ حیرت سے ٹکر ٹکر اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"زندہ ہوں یار لائبہ بھا بھی! اس حیدر نے تو مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

حد ہوتی ہے مذاق کی بھی۔ اس نے تو ہماری جان ہی نکال کر رکھ دی تھی۔"

"وہ تو مجھے دکھ ہی رہا ہے۔ اس نے لو دیتی نظرؤں سے قاربہ کو دیکھتے ہوئے معنی خیزی سے کہا جو بھیگی

آنکھوں کو رکڑ رہی تھی۔

"شکر ہے کہ تم زندہ ہو ورنہ تو اس نے رو رو کد سمندر بھا دینے تھے۔" لائیبے نے شدارت سے کہا تھا۔ لیکن اس کا دل تھا

کہ بہد بہد آرہا تھا۔ وہ کہاں اب اس کے بغیر جینے کا تصور کر سکتی تھی؟

باہر گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ اشعد اسے لینے آچکا تھا۔ میں چلتی ہوں۔ تم اس کا دھیان رکھو۔ صوفے پر سے بیگ اڑھا کر لائیں نے چھٹتے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے بعد ریاض نے اسکا بازو پکڑھ صوفے پر بٹھا دیا تھا۔ اور خود گھدی سانس لیتا میز کے کونے پر بیٹھ گیا تھا۔

"ادھر دیکھو میری طرف۔" اس کے کانپتے ہاتھ کو گرفت میں لے کر اس نے فاریہ کا چھڈہ اوپر اڑھایا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ صرف اتنی سی بات پر تمہارا اظہار محبت سننے کو ملے گا تو میں یہ حرکت بہت پہلے ہی کر چکا ہوتا۔

"یہ اچھا طریقہ ہے۔ پہلے مجھے اپنی عادت ڈال دی۔ اور اب خود مدننا چاہتے ہیں؟ ٹھیک ہے۔ میری بلاسے شوق سے مر جائیں آپ۔" اس کا بھیگا، خفا خفا سالہجہ اسے بے ساختہ مسکدانے پر مجبور کر گیا تھا۔

"تو تمہیں ابھی تک صرف میری عادت ہوئی ہے؟ محبت نہیں ہوئی؟"

"عادت سے پہلے محبت ہوئی تھی۔ وہ اسے نا دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سد سد کرتی ناراضنگی سے بولی۔ " یہ سانحہ کب ہوا؟ مجھے کیوں لا علم رکھا اس سے؟" ہاتھ کی مٹھی بنا کر لہوں پر رکھے اس نے حیدانگی سے پوچھا۔

"بہت پہلے--"

"جب تمہارے بھائی نے مجھے مارا تھا؟ یا تب، جب میں نے تمہارے بھائی کو مارا تھا؟" اس کے شوخی سے کہنے پر فاریہ نے ناراضنگی بھڑی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ جس کی بداون آنکھوں میں دم سے روشن تھے۔

"مجھے غصہ آ رہا ہے آپ پر، بہت زیادہ۔ بات نہیں کریں مجھ سے۔" اس کا ہاتھ جھٹک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ فاری میری بات تو سنو یار!!۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے ہی آوازیں دیتا ہوا روم میں آیا تھا۔

"میرے دل کی ملکہ" اس نے اچانک ہی فاریہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔

"آج معاف کر دو۔ آئندہ کبھی تمہیں اپنی وجہ سے رونے نہیں دوں گا۔ اس کے آنسو اپنی پوروں پر چنتے ہوئے وہ محبت سے بولا۔

بادلوں کے پردازے کی اوٹ سے جہانگرتا چاند کھلی ہوئی
کھنڈ کیوں میں انہیں نکلتے ہوئے، محبت کی اس نئی داستان
کو شروع ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”اشعد بھائی کہتے تھے کہ آپ سب سے مختلف ہیں۔ ان
کے باقی دوستوں میں سب سے الگ۔ سب سے منفرد۔
سب سے زیادہ کٹیرنگ اور سب سے زیادہ شدت پسند“۔
اس کی شدت کے بُننوں کو چھیدتے ہوئے وہ بھیگی پلکوں
سے کہے جا رہی تھیں۔

”اور؟“ وہ بھمہ تن گوش ہوا، اس کی مدهم بھروسی آواز کو دل
کے نہاں خانوں میں سجاتا، مزید سننے کی آزوں کد رہا تھا۔

”اور-- سب سے زیادہ محبت کرنے والے“۔ اس کی
گھردے سمندر کی کالی آنکھیں ریاضتی کی پر شوق نظرؤں
سے ٹکدائیں تھیں۔ محبت کے ساز پورے سروں میں بجتے
ان دونوں کو اپنے حصے میں قید کر گئے تھے۔

”تو تم نے مجھے کیسا پایا؟“

عشق کی راہ کے مسافر نے اسے ہمداہ لے جانے کے لیے
اپنا ہاتھ اس کے جانب پھیلا�ا تھا۔
”میں اشعد بھائی سے متفق ہوں۔“

اس نے ساری دنیا سے علیحدہ کر کے اسے صرف اپنے نام
سے باندھ کے رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس نے صرف
اپنا چہدہ ہی بسایا تھا۔ اس کے لبوں پر اپنے علاوہ کسی کا

ذکر نہیں رہنے دیا تھا۔ اس کی سوچوں میں، اس کے خیالوں
میں، اس کے علاوہ کسی کا گزر بس نہیں تھا۔ پھر وہ بھلا
کیوں کہ اس کا ہاتھ جھٹک سکتی تھی؟
مہکتی ہوئی پھولوں کی راہ گزر پر اس کا ہاتھ تھامے اس
کے ساتھ چلتے کو وہ دل و جان سے راضی تھی۔

گولڈن شیدروانی اور مہدون کلد کی پگدی باندھے، جو رونق
اس کے چہرے پر تھی، کیا ہی کہنے تھے اس کے ۶۰
نسل لگ جانے کی حد تک پیارا لگ رہا تھا۔
”ماشاء اللہ ایسا دولہا تو ناکبھی بنا اور نا کبھی کسی نے
دیکھا۔ کافی دید سے وہ آئنے کے سامنے کھڑا خود کو
مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے، خود پر ہی صدقے واری
جا رہا تھا۔

”یار مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔ کیا سچ میں میدی شادی
اے آج؟“ اپنے کمرے میں ہی ریڈی ہوتے ریاض اور اور
تیمور سے وہ ۴ دو سیکنڈز بعد پوچھ رہا تھا۔ جو یقیناً اس
کے جذبات محسوس کر سکتے تھے۔ اس لیے اس کے بارے
بار پوچھنے پر جھڈکنے کے بجائے مسکرا دے تھے۔
اگر اس کے روم کی کھڑکی سے زدایی جهانک کہ دیکھو
تو پورج میں الگ ہی رونق لگی ہوئی تھی۔ ڈھول باجون اور
پٹاخوں کا اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی

تھی۔ آتش بازی بھی اتنے زور و شور سے کی جا رہی تھی کہ لگتا تھا جیسے آسمان پر دنگوں اور روشنیوں کی بارات کی اندی ہوئی ہے۔

صرف ایک تو ہی بچا تھا۔ آج سے تو بھی اپنے گھر بار کا ہو جائے گا۔ تیمور نے مصنوعی افسوس سے کہتے ہے
شال کو اس کے گندھوں پر پھیلایا تھا۔

فائلنی! لیکن مجھے ابھی لگ رہا ہے کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ حیدر کی خوشی چھپائے نہیں مچپ رہی تھی۔

کرسٹل بیکوئیٹ کو جاتی وہ روڈ، اس طرح سے ٹریفک سے بالا گوچکی تھی کہ لگتا تھا جیسے سارا کداچی شہد اس کی شادی میں شرکت کے لیے املا آیا ہے۔ پھولوں سے سجنی گاڑیوں کی ایک قطاری لگی ہوئی تھی۔ جو سوت روی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ حیدر نے بھی تو پوری جامعہ کے ہی دوستوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ جو اس سے بھی زیادہ پرجوش سے خوشی خوشی پہنچ گئے تھے۔

سب سے آگے حیدر کی ہی کار تھی جسے احمد ڈرائیو کر رہا تھا۔ حارث کی شادی میں جو اپنی حرکتوں کی وجہ سے ان کا تھاںے کا چکر لگا تھا، اس کے پیش نظر اس بار احمد اور عمید دونوں ہی پوری کوشش کر رہے تھے کہ ان پانچوں کو کسی بھی طرح قابو میں ہی رکھا جائے۔ حیدر کی طرف

سے انہیں زیادہ فکر تھی۔

جس کا بس نہیں چلتا تھا کہ گاڑی سے اتر کر وہ خود ہی
بھنگتے ڈالتا ہوا ہال پہنچ جائے۔

ان کے پیچے والی گاڑی اشعد کی مدرسیڈز تھی جس میں
وہ چاروں موجود تھے۔ ریڈ سگنل پر جب گاڑیاں رگیں تو ساری
گاڑیوں کے دروازے کھلے تھے۔ جن میں سے عجلت میں وہ
لوگ اپنی پستلز لوٹ کرتے ہوئے باہر نکلے تھے۔ سگنل کھل
چکا تھا۔ لیکن ان کی وجہ سے پوری شاہدah اتنے رش کی
وجہ سے جام ہو چکی تھی۔ اب بھلا ٹریفک سگنل پر ڈھیدوں
کی تعداد میں گاڑیاں جمع کر کے کون سے ڈھول باجے بجا کر
بھنگتے ڈالے جاتے تھے؟

بد سر اقتدار پارٹی کے رہنماء کے بیٹے کی حیثیت سے
بھی فل میڈیا کو ریج کی جا رہی تھی۔ اس شادی پر جتنا
خدقہ کیا جا رہا تھا۔ جس تعداد میں اسلحے اور آتشبازی کا
استعمال ہو رہا تھا۔ نیوز چینل پر لائیو بیٹھے سارے اینکرڈر
کاغذوں کے پلندے لے ظہور دلاور کی جائیداد اور ذرائع آمدن
کو کھنگالنے میں پلکان ہو رہے تھے۔

”شادی میری ہے اور مجھے ہی فائزنگ نہیں کرنے دے
رہے“۔ تیمور کو فضنا میں ہاتھ اونچا کیے فائزنگ کرتے
دیکھ، دو دل مسوس کر احمد سے بولا۔ جس نے سختی سے
اسے کار سے اتنے سے منع کیا تھا۔ منع تو اس نے ان

چاروں کو بھی کیا تھا۔

لیکن ایسے موقع پر وہ کہاں پیچھے رہ سکتے تھے۔

"تو ہوائی فائرنگ نہیں کرے گا تو بھی تیدی شادی ہو جائے

گی۔ سفید کرنے کی آستینوں کے کف کو پیچھے پلٹتے

ہوئے وہ بے نیازی سے بولا۔ تبھی پولیس کی گاڑی کا

سائین وہاں گونجا تھا۔

"بس! ہو گیا کام۔ احمد بڈبڑاتے ہوئے فون نکال کر کوئی نمبر

ڈائل کرنے لگا تھا۔

روایتی عدوسی سرخ رنگ کے بجائے اس نے ڈل گولڈن کلر

کے ہم رنگ کام سے مذین لہنگے کو تدرجیح دی تھی۔ میچنگ

جیولری اور چوڑیوں کے ساتھ میک اپ سے چہرے کے نقوش

اور بھی خوبصورت بنائے وہ واقعی میں کوئی سنہدی

شہزادی لگ رہی تھی۔ فلورل ڈیکوریشن کے باعث اس وسیع

استیچ پر خوشناما پھولوں کی بھاریں اتری ہوئی تھیں۔ سرخ

رنگ کے نیٹ کے دوپٹے سے اس نے چہرہ ڈھانپ رکھا

تھا۔ جس پر سنہدی ہی دھاگے سے "حمدہ کی دلہن"

کے الفاظ کنندہ تھے۔

عام دلہنوں کی طرح وہ نظریں جھکا کر نہیں بیٹھی تھیں۔

بلکہ چہرے پر دبی دبی سی مسکدابٹ لیے وہ انڈنس کی

جانب بھی دیکھ رہی تھی، جہاں سے بارات کا استقبال کیا

جا رہا تھا۔ زر نور اور مناہد سے وہ کئی بار ڈانٹ سن چکی
تھی لیکن اس سے کہاں استیچو بن کر ایک جگہ بیٹھا جا
سکتا تھا۔

جس شان سے وہ بارات لے کر آیا تھا، دیکھنے والے
میہوت ہو کر دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ جب گھر سے چلے
تھے تو سب گاڑیوں میں سوار تھے۔ لیکن بینکوئیٹ پہنچے
تو سارے لڑکے ہیوی بائیکس پر ہیلمٹ پہنے بیٹھے تھے۔
جنہیں دیکھ کر صرف یہی لگتا تھا کہ کوئی ریلی وہاں سے
گزر رہی ہے۔ جہاں ڈھول کی تھاپ پر رقص کیا جا رہا تھا۔
وہیں فاصلے فاصلے سے کانچ کی بوتلوں میں راکٹس بھی
لگائے جا رہے تھے۔ جو فضنا میں جاتے ہیں رنگوں میں بکھر
جاتے تھے۔ شور اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ
دیتی تھی۔ سب سے آگے تو دولہا خود ہی سہمے کی
لڑیوں کو پیچھے پلٹے بائیک پر سوار تھا۔

مخملی صوفے پر بیٹھے، ان دونوں کے سامنے پڑی
شیشے کی میز پر نکاح نامہ پڑا تھا۔ ساتھ میں سنگل
صوفے پر بیٹھے مولوی صاحب نکاح کی کاروائی شروع کر
چکے تھے۔

"یشفہ بنت حمین آپ کو حمزہ حیدر علی ولد ظہور دلاور
علی کے نکاح میں بعوض پچاس لاکھ حق مہد کے دیا جاتا

۔۔۔ کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟ پورے ہال میں معنی خیر سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب کی نظریں ان دونوں پر تھیں جو چاند سورج کی جوڑی بنے بیٹھے۔

انگلی کی پور سے اس نے آنکھ کے کنارے پر آئے آنسو کو صاف کر کے صرف ایک نظر اپنے برابر میں بیٹھے حیدر کو دیکھا تھا۔ جس کا سد جھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کے چہرے کی مسکراہٹ کو وہ باخوبی دیکھ سکتی تھی۔ ڈھیر سارے کیمروں کی فلیش سے استیج جگمگا رہا تھا
”قبوں ہے!“ لذتے لبوں سے اس نے آہستہ سے اپنی رضامندی دی تھی۔ تین دفعہ اس سے اقدار لینے کے بعد اب سب حیدر کی جانب متوجہ تھے۔

حمسہ حیدر علی ولد ظہور دلاور علی کیا آپ کو یشفہ بنت حمین سے سکھ رائج الوقت نکاح قبول ہے؟“ وہ خود کو جتنا زیادہ سنجیدہ بنائے کی کوشش کر رہا تھا اتنا زیادہ ہی ناکام دکھائی دے رہا تھا۔

ابھی بھی وقت ہے، سوچ لے۔ ”وہ لوگ پیچھے کھڑے اسے ڈراتے ہوئے باز رہنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ لیکن آج اس نے اپنے دل کے علاوہ کہاں کسی کی سمنی تھی۔
”قبوں ہے!“ اس کا کہنا تھا کہ مبارک سلامت کا ایک شور سا اٹھا تھا۔

نکاح نامے پر دونوں کے دستخط ہو جانے اور دعا کے بعد،

فاریہ نے اس کا نیٹ کا دوپٹہ اتار دیا تھا۔

میں صدقے جاؤں!" وہاں موجود سینکڑوں لوگوں کی پرواہ کیے بغیر وہ یک ٹک یشفہ کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"آج تو غصب ہی ہو گیا۔ حیدر کو پہلی بار کوئی اپنے علاوہ صدقے واری جانے کے قابل لگا ہے۔ اس کی سے اختیاری میں کہی گئی بات پر سب ہی اس کا ریکارڈ لگانے لگے تھے۔

"شادی مبارک! شادی مبارک! شادی مبارک!" استیج پر قبضہ کیے وہ سارے اسے گھیر کر گلب کے پھولوں کی تھالوں میں سے پھول لے کر اسے مارتے ہوئے ایک ہی گردان کیے جا رہے تھے۔ جبکہ استیج کے سامنے ہی بڑے سے ڈانس فلور پر یونی کے سارے دوست مجتمعہ لگا کر گدوپ ڈانس کے لیے گانے سلیکٹ کر رہے تھے۔ حیدر کی توجہ ناپا کر مناہل نے آرام سے اس کے پید سے جوتا اتار لیا تھا۔

"اس سے پہلے کہ ہم تمہیں اماؤنٹ بتائیں۔ تم بلینک چیک ہی دے دو۔ ہالوں کو جھٹک کر پیچھے کرتے ہوئے وہ اٹھلا کر بولی۔

میدے ابا کچھو سے اسمگل نہیں کرتے۔ جو میں تمہیں بلینک چیک کاٹ کر دوں۔ وہ ہاتھ جھلا کر بولا۔

تب تک یشفہ کی ساری کذنب بھی دودھ کے سچے ہوئے
گلاس کو ٹھے میں رکھے آچکی تھیں۔

"حیدر بھائی! اس دودھ کے دو لاکھ سے کم نہیں لیں گے
ہم"- ایک نے قطعی انداز میں کیا -

دو لاکھ کا کیا کرو گی بہن؟ کم از کم دس لاکھ تو مانگو۔"

تیمور کے مشورے پر قائل ہو کہ انہوں نے اپنے مطالبے کی
رقم کو دو سے بڑھا کر دس کر دیا تھا۔

"سارے پیسے شادی میں خرچ ہو گئے۔ ایک پھوٹی کوٹی
نہیں بچی میدے پاس"-

اُس نات فتل! ہمیں پیسے چاہئے - یشفہ کے سارے کذنب
شور شدابہ بچاتے ہوئے اب "پیسے دو۔ پیسے رو" کے
ندرے لگانا شروع ہو چکے تھے۔

کدھر سے آئے ہیں یہ لوگ؟" اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر
رکھتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔

کوئی بہانہ نہیں چلے گا پیسے دینے پڑیں گے"-

یقین مانو میدی بہنوں! ان لوگوں نے مجھے مہندی میں
پوری طرح سے لوٹ لیا تھا۔ میں سچ میں کنگال ہو چکا ہوں
۔" وہ از حد غمگین تھا۔ ایک تو اس کے بے وفا دوست بھی
اس کا ساتھ دینے کے بجائے اپنی گروپ فوٹوز بنوانے میں
مصروف تھے۔

میدی کذنب اور میدی فریڈنڈ جتنے پیسے مانگ رہی ہیں

انہیں دے دور نہ میں نے رخصتی نہیں کروانی - یشفہ نے
دھیمی سی آواز میں دھونس سے کہا -

تمہارے لیے تو میں اپنی جان بھی دے دوں - " وہ دلنشیں
سا بولا - اس کو ایسے رنگ بدلتے وکچھ یشفہ نے جھینپتے
ہوئے رخ موز لیا تھا -

کہا تو اس نے ہلکی آواز سے ہی تھا - لیکن استیح پر
چڑھے سارے لوگوں کی سماںتوں پر بھی آرام سے وہ آواز
پڑی تھی -

جس پر سب نے ہوٹنگ کرتے ہوئے ہنگامہ مچا دیا تھا -

لاکھوں ملے ، کوئی بھی نہ تم سا ملا --

میرا یہ دل ، تیری اور چلتا گیا ، نہ رکا --

میرے یاراں --

صف سترہی سڑک پر اس کی گاڑی فدائے بھرتی دوڑتی
جا رہی تھی - میوزک پلٹیڈ پر فل والیوم پر بجتے گانوں کے
ساتھ ساتھ وہ بھی ہم آواز ہو کر گا رہا تھا - رخصتی کے
بعد وہ دونوں سب سے پہلے ہال سے نکلے تھے - لیکن
تھوڑی ہی دور جا کر جب سنسان سڑک کا سلسلہ شروع ہوا
تو گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی - کیونکہ ٹائر پنکچر ہو
چکا تھا -

میری لائف میں اتنے استند گل ہیں کہ شاید ہی کسی کی

زندگی میں ہوں گے"۔ گاڑی سے اتر کر وہ بڑیاتے ہوئے پنکچر ہوئے ٹائی پر ٹھوکر مار کر بولا۔

جب تک وہ بھی دونوں ہاتھوں میں لہنگا سنبرھالتی باہد اتر آئی تھی۔

تم تو اندر بیٹھو جا کر"۔ فون پر نمبر ڈائل کرتے ہوئے حیدر نے اسے کہا۔ جو ان سنی کرتی سیلفی کلک کرنے گئی تھی۔ جب تک دوسرا جانب رابطہ مل چکا تھا۔ ریاض کو مختصرًا اس نے پنکچر کا بتا کر لوکیشن سینڈ کی تھی۔

جس نے دس منٹ میں ہی گاڑی لانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ رات اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن وہ علاقہ اندھیہ میں ڈوبا، سنسان پڑا تھا۔

وہ یشفہ کو گاڑی میں بیٹھنے کا کہنے ہی لگا تھا کہ جہیں دور سے آتی گاڑی کی لائنٹس اسے نظر آئی تھی۔ ہال سے وہ لوگ دور نکل آئے تھے۔ ریاض اتنی جلدی تو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ گاڑی ان کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئی تھی۔ لیکن تھوڑے ہی منٹ میں ریورس ہو کر دوبارہ وہاں آئی تھی۔ اس سے پہلے کہ حیدر ساری سچویشن کو سمجھ پاتا۔ دو تین نقاب پوش اسلحہ ہاتھوں میں لیے گاڑی سے نکل آئے تھے۔

"گھر سے بھاگ کر شادی کی ہے تم دونوں نے؟" ایک نے کرخت آواز میں گھردک کر پوچھا۔

اس حلیے میں گھر سے کیسے بھاگ سکتے ہیں ہم؟ پاگل ہو کیا؟ یشفہ نے بدا مان کر کہا۔

"تم تو چپ کر جاؤ"- حیدر نے دانت پیستے ہوئے اسے خاموش رہنے کو کہا تھا۔

"لاو دولے میان! سلامی نکالو ہماری"-

"دولے سے سلامی مانگتے نہیں، بلکہ اس کو دیتے ہیں - اتنا بھی نہیں معلوم؟ کتنے بے وقوف ہو یاد تم۔

"تو تمہیں سلامی چاہیئے؟" ایک نے فوراً ہی پشت سے پسٹل نکالی تھی۔

انہیں لگا تھا کہ وہ دونوں اسلحہ دیکھ کر گھبرا جائیں گے - ان کے اندازے کے مطابق حیدر کا رنگ تو پڑا تھا لیکن یشفہ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

موبائل نکال رہا ہے یا پھر ٹھوکوں تجھے؟" ایک نے خطرناک تیوروں سے گھوڑتے ہوئے کہا۔

نهیں ملے گی سلامی! مار دو گولی"- بونٹ سے ٹیک لگائے، سینے پر بازو لپیٹے یشفہ کا اطمینان قابل دید تھا - وہ تین سے چار نا معلوم افراد تو رہے ایک طرف، خود حیدر آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

"پاگل ہو گئی ہو یشفہ؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟" حیدر کا سانس سینے میں اٹکنے لگا تھا۔ ابھی شادی کو دو گھنے بھی پورے نہیں گزرے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یشفہ

اتنسی بے وفا ہے۔ لیکن وہ اس کی جانب متوجہ ہی کہاں تھی۔

"رک کیوں گئے بھائی؟ مارو ناں گولی۔" حیدر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح اس کا منہ ٹیپ سے بند کددے۔

جس نے اسے شہید کروانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

یشفہ!" وہ بے یقینی سے ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھ رہا تھا نقلی پیٹل ہے۔ اس کے ہاتھ جھلا کر کہنے پر جہاں وہ

بھونچ کا رہ گیا، وہیں ان ڈاکوؤں کے رنگ بھی آئے تھے۔

اگدیہ نقلی پیٹل چل سکتی ہے تو بے شک اس کے ساتھ تم مجھے بھی مار دو۔ وہ ہنستے ہوئے منے سے بولی۔

اس کے علاوہ بھلا کسے اصلی اور نقلی اسلحے کی پہچان ہو سکتی تھی؟

"چور کو پڑ گئے مور۔" یشفہ ان کے ناثرات کو خاصاً انجوائے کر رہی تھی۔

"دیکھ لیں گے تمہیں"۔ وہ لوگ دھمکیاں دیتے وہاں ایک سیکنڈ بھی مزید نہیں رکے تھے۔

نهیں کیسے پتا کہ وہ نقلی ہے؟" وہ مشکوک سا اس کی جانب گھوما۔

تم نے بہت بلکا نہیں لے رکھا مجھے؟" وہ آنکھیں سکیٹر کر بولی۔

زیادہ کی ڈیمانڈ تو ہم خود بھی نہیں کر دیے۔ بس نیک کے ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے میں ہاتھ پر رکھ دے۔ اس کے کمے کے باہر وہ چاروں دھرنے دے کر بیٹھے تھے۔ جہاں لڑکیوں نے جی بھر کد اسے لوٹا تھا، وہیں اب یہ لوگ بھی اس کا باقی کا دیوالیہ نکالنے کے لیے آپنچے تھے۔ ایک لاکھ اکیاون ہزار کا کیا حساب ہوتا ہے؟" اشعد نے سمجھی سے پوچھا۔

ڈیڑھ لاکھ میرے۔ ایک ہزار تم چاروں گا۔" -
ڈیڑھ لاکھ کے ساتھ دو تھیڈ بھی تھے مفت میں ملین گے۔" تیمور نے گھور کر کہا۔

نہایت ہی افسوس کے ساتھ مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ میں بینک کریٹ ہو چکا ہوں۔ میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں بچی تم لوگوں کو دینے کے لئے۔ مہربانی کد کے یہاں سے تشریف لے جاؤ تم سارے۔" جہاں حیدر نے ضبط سے کہا تھے۔

وہیں وہ لوگ جانے کے بجائے دروازے کے پاس ہی پھیل کر بیٹھ گئے تھے۔

"حارت کارڈ نکال! ایک بازی ہو جائے۔ جہاں تیمور نے ساتھ ہی حیدر کا بھی ہاتھ کھینچ کر بتھا لیا تھا۔ وہیں حارت نے فوراً ہی کوٹ کی اندرونی جیب سے کارڈ نکال لیے تھے۔ ساری تیاری کد کے آئے تھے آخر کو۔

گھر میں رکے ہوئے مہمان بھی انہیں دیکھ کر مسکرا دے
تھے۔

دھیان کدھر سے تیدا صحیح سے تو کھیل " - دوسرا بار
ہارنے پر تیور نے مصنوعی حیثت سے کہا - جو شدید ضبط
کیے وہاں بیٹھا تھا۔

" چائے پینے کون کون چل رہا ہے ؟ " ویسٹ کوٹ کو بازو پر
ڈالے اس نے سوالیہ انداز میں ان سب سے پوچھا - جو لمحہ
بھی صنائع کیے بنا فورا سے اٹھ کھڑے تھے - حیدر نے
بھی سکون کا سانس بھدا تھا کہ چلو ان سے تو جان
چھوٹی۔

" کدھر بیٹھا ؟ " اسے بالٹ پر ہاتھ رکھے دیکھ احمد نے اس
کی گردن میں بازو ڈال کر پوچھا -
تم لوگ جاؤ چائے پینے - میدا موڈ نہیں " - اس نے انداز کو
بے نیاز سا بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔
موڈ تو تیدا ہم بنائیں گے - " وہ لوگ اسے زبردستی باہد لے
گئے تھے۔

جس کی ان کے سامنے ایک نہیں چل رہی تھی - لگتا تھا
جیسے زندگی بھر کے سارے بدلتے وہ لوگ ایک ساتھ ہی
لے رہے تھے --

چائے پینے اور کافی دیر تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے

بعد رات کے کوئی چار بجے انہوں نے اس کی جان چھوڑی
تھی۔

شکد ہے تم آگئے۔ یار میدی پنڈ نکالو دوپٹے میں سے ” -
ڈریسنگ کے سامنے کھٹدی وہ سد پے سجے بھاری سے
دوپٹے کی وجہ سے الجھی ہوئی تھی۔ اسے وہاں داخل
ہوتے دیکھا تو تشکد کا سانس بھرا۔

”تم جاگ رہی ہو ابھی تک؟“ حیدر کو خوشگوار سی حیرت
ہوئی تھی ورنہ تو اسے لگا تھا کہ اتنی رات ہونے کے بعد
وہ یقیناً سوچکی ہو گی۔

کچھ دید تو انسان بنی رہو۔ اچھی لگ رہی ہو ایسے ” - حیدر
کی پد شوق نظریں اس کے سرابے سے ہٹنے کو راضی
نہیں تھیں۔

”میدی بس ہو چکی ہے اب۔ میں مزید نہیں برداشت کر
سکتی یہ“ - وہ جھنجھلا کر بولی۔

اس کے مہکتے ہوئے حنائی ہاتھوں کو گرفت میں لیے وہ
لمحے کے لئے بھی اس پر سے نگاہ نہیں ہٹا رہا تھا۔ یشفہ
کو مہندی پسند نہیں تھی۔ لیکن حیدر نے صند کر کے
زبردستی اس کے دونوں ہاتھوں پر بھر بھر کد مہندی
لگوائی تھی۔ جن کا رنگ اس کی محبت کی طرح کافی
گھبرا چڑھا تھا۔

”کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تمہاری محبت مجھے اپنا

اتنا اسید کد لے گی۔“ بھاری لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اس کی پیشانی کی زینت بنے ٹیکے کو اتار لیا تھا۔ وہ سانس روکے اسے اتنے قدیب کھٹے دیکھ رہی تھی۔ ”ایک وقت تھا جب تمہیں دیکھ کر مجھے غصہ آیا کرتا تھا اور آج یہ وقت ہے کہ تمہیں دیکھے بنا مجھے چین ہی نہیں پڑتا۔

کیا جادو کر دیا تم نے مجھ پر؟“ وہ حیرانگی سے کہتا یہ ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

جس کی نگاہوں کی تپیش سے اس کا چہرہ سدھ پڑتا جا رہا تھا۔ حیدر کا یہ روپ تو وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ جو جتنا انجان تھا۔ اتنا ہی جان لیوا بھی۔ اس کے ہاتھوں کی اڑھتی وہ مہندی کی مہک اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔

رات قدرہ قدرہ بھیگ رہی تھی۔ اس کے بے ہوئے روم میں ذو معنی سی خاموشی کا راج تھا۔ جہاں صرف ان کے دل دھڑکنے کی آواز تھی جو وہ دونوں با خوبی سن پا رہے تھے۔

سفد تو انہوں نے بھی جھیلا تھا۔

کٹھنائیاں تو انہوں نے بھی کائی تھی۔

محبت کے راستوں پر چلننا اتنا آسان تھوڑی تھا۔

ہد کسی کے بس میں نہیں ہوتا وہ آگ کا دریا عبور کرنا۔

اور جو کد کے اس سے بڑھ کر قسمت کا کوئی دھنی نہیں ہوتا۔ ان کا سقد بھی انتقام کو پہنچا تھا۔ جہاں مہکتا ہوا ایک جہاں ان کا منتظر تھا۔

وہ واش روم سے وضو کر کے باہر نکلا تو چھرے اور بازو پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس پر نظر پڑی تو عنابی لب مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔ سیاہ چادر کے ہالے میں اس کا گلبائیں چھرہ معصومیت میں ڈھلا ہوا تھا۔ ہیز لگرین آنکھوں پر پلکوں کا پھرہ تھا۔ جائے نماز اس کے ہاتھ میں تھی۔ وضو کر کے وہ نماز کے انتظار میں ہی بیٹھی تھیں لیکن نیند کی شیدائی اس لذکری کو خوابوں کی وادیوں میں اتنے میں صرف چند لمحے ہی لگتے تھے۔

"نور!" گھٹنوں کے بد اس کے سامنے فرش پر بیٹھتے اس نے نرمی سے پکارا۔ احمد نے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھا تو جائے پہچانے لمس کے اثر سے وہ کچھ نیند سے بیدار ہوئی تھی۔

کیا ہوا؟" حنائی ہاتھوں سے آنکھوں کو رگڑتی وہ سوئی جاگیں کیفیت میں اٹھ بیٹھی تھیں۔

"نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ اس کی پیشانی پر مہد ثبت کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
کیا وہ سب یہیں پر رکے ہوئے ہیں؟" زر نور کو ٹینشن تھیں

تو بس ان چاروں کی -

"کیا مجھے ان کے لئے ناشتہ بنانا پڑے گا صبح؟" بس
یہی فکر اسے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ اس کا
خانسامان ہمیشہ کی

طرح اسے دغا دے کر کل بھی چھٹی کرنے کا عندیہ دے
گیا تھا۔

یہ نہیں تھا کہ اسے کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ وہ جس بھی
طرح کا بناتی تھی، احمد اس میں نقص نہیں نکالتا تھا۔
بلکہ چپ چاپ کھا لیا کرتا تھا۔ لیکن وہ اس کے دوست
تھے۔ جو اس کی طرح بد گز نہیں تھے۔ انہوں نے تو اس کا
ریکارڈ لگا دینا تھا۔

"سکون سے اپنی نیند پوری کر لینا۔ ناشتہ میں بازار سے
لے آؤں گا۔" احمد کو معلوم تھا کہ شادیوں کی وجہ سے وہ
ٹھیک سے سو بھی نہیں سکتی تھی۔

"احمد تم بہت اچھے ہوں۔ وہ تشکر سے بولی۔
"نوازش سے آپ کی۔ ورنہ میں ناجیز کھاں آپ کی تعریفوں
کے قابل ہوں۔" وہ عاجذی بھروسہ شدارت سے کہتے ہوئے روم
سے باہر نکل گیا تھا۔

زر نور سے بے ساختہ سد پہ ہاتھ مارا تھا۔ اسے ناشتہ بنانے
کی فکر لاحق تھی۔ لیکن یہ بات تو فراموش ہی کر گئی
تھی کہ لائیب فاریہ، انوشے اور لائیب بھی تو وہیں ٹھہری

ہوئی تھیں۔ ان کی موجودگی میں اب بھلا اسے کسی
ٹینشن کی کیا ضرورت تھی؟ ڈھیروں اطمینان اس کے اندر
اتدا تھا۔

اس کا رخ گیست روم کی جانب تھا۔ جہاں وہ لوگ رکے ہوئے
تھے۔ رات زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ احمد کے گھر
ٹھہر گئے تھے۔ ساری رات جاگنے کے بعد فجر سے
کوئی آدھے گھنے پہلے، وہ سب نیند کی وادیوں میں اترے
تھے۔ اس نے سوچ بورڈ پر ہاتھ مار کر ساری لائنس جلا
دی تھیں۔ جہاں بیڈ پر اشعد، ریاض اور تیمور کا قبضہ تھا۔
وہیں حارت صوفے پر دنیا و مافیا سے بے خبر سو رہا تھا۔
احمد کو صرف چند منٹ لگے تھے انہیں ہوش کی دنیا میں
واپس لانے ہیں۔ ان تینوں کو جلد سے جلد مسجد پہنچنے
کی تلقین کر کے حارت کو وہ اپنے ہمراہ ہی لے کر گیا تھا۔
کیونکہ اس کی نیند سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔
دور مسجدوں سے ابھی بھی اذانوں کی پد نور سی آواز
سارے میں بکھری ہوئی تھی۔ سیاہ آسمان صاف اور
شفاف پڑا تھا۔ اپنا وقت پورا کر کے چاند بس وہاں سے
نکلنے کی تیاری میں تھا۔ کھنکتی سرد ہواں کا راج ابھی
بھی قائم تھا۔ پلکا پلکا سا دھوکا بھی
چاروں سمت میں پھیلا ہوا تھا۔ جوتے ایک جانب اتار کر وہ

مسجد میں داخل ہو چکے تھے۔ ٹھنڈے ماربل کے فرش پر
قدم رکھتے ہوئے وہ اندرونی سمت بڑھ گئے تھے۔ جہاں
نمازیوں کے لیے ٹھنڈ کی وجہ سے دریاں بچھی ہوئی
تھیں۔ ان کے مقابلے میں فجر کے وقت وہاں نمازیوں کی
اتنی تعداد نہیں ہوتی تھی۔ آج بھی عام طور پر آنے والے
لوگ ہی موجود تھے۔ کچھ وضو میں مصروف تھے تو کچھ
تسبیحات میں مشغول تھے۔ باقیوں کی آمد کا سلسلہ بھی
جاری تھا۔

نیند سے بھری آنکھوں کو با مشکل کھولتے ہوئے، وضو کی
وجہ سے بھیگے چھڑے لئے جب وہ لوگ مسجد میں داخل
ہوئے تو نماز بس شروع ہونے کو تھی۔
سفید کرتا شلوار میں اس کی رنگت اور بھی دمگ رہی
تھی۔ اس کی گئے آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جو جانے
کتنے ہی رازوں کی پھرے دار تھیں۔ وہ سب سے آگے کھڑا
تھا۔ ڈھلکے شانوں اور جھکی گدن کے ساتھ امامت کروا
رہا تھا۔ جس کے پیچھے ایک صاف میں باقی نمازیوں کے
ساتھ وہ بھی کھڑے تھے۔

اپنے جان سے عزیز دوستوں سے اسے اتنی محبت تھی کہ
وہ صرف انہیں دنیا میں ہی اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔
بلکہ آخرت کی زندگی میں بھی وہ ان کے ساتھ کا تمنائی
تھا۔

صباح کی پوپہوٹ چکی تھی۔ رات اپنی تاریکیوں کو آگوش میں سمیٹے بھیگ چکی تھی۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ لیکن ہلکا ہلکا سا اجالا وہاں پھیلتے ہوئے، اس کی آمد سے باخوبی آگاہ کر رہا تھا۔ گھنے درختوں سے جھولتی شاخیں اپنی ہی تدنگ میں باد صباء سے الکھیلیاں کرتیں مسدوں کی تھیں۔ سیاہ رنگ کو اتار کر آسان نے نیلے رنگ کی چادر تان لی تھی۔ جہاں کہیں کہیں بھولے بڑھکے سے بادل بھی نکل آئے تھے۔ گھونسلوں کو خیر باد کہتے سارے چند پرند رزق کی تلاش میں رب کی حمد و ثناء کرتے آسان کی بلند پرواز پر نکل چکے تھے۔

اس سد سبز و شاداب علاقے کی گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ لوگ خانزادہ ولا واپس جانے کے بجائے واک پر نکل گئے تھے۔ رات کو دیر سے سونے اور صبح دس بجے اٹھنے والے لوگ جب فجر میں اٹھنا شروع کرتے ہیں تو جو پاکیزہ سا اطمینان ان کے قلب کو راحت بخشتا ہے یہ صدق وہی جان سکتے تھے۔ اگر پیچھے چلتے وہ لوگ ہلکی پھلکی گفتگو میں بھی مشغول تھے۔ لیکن کسی کی کمی محسوس ہو رہی تھی تو وہ حیدر کی تھی۔

دوستی کھنے کو مختصہ سے حروف پر مشتمل ایک چھوٹا

سا ہی لفظ ہے - لیکن کتنے گھرے رشتہوں اور جذبات کو
اپنے اندر سموٹ ھٹا دے -

میں ارمان احمد خانزادہ! مجھے اپنی بیوی اور کافی سے
عشق ہے - لیکن اتنی ہی محبت میں اپنے دوستوں سے
بھی کرتا ہوں۔"

وہ روم کا شہری تھا - بیوی کی محبت میں پاکستان تو چلا
آیا تھا - لیکن دوستوں کی محبت کی وجہ سے واپس نہیں جا
سکا تھا - اسے اپنی کافی سے شدید محبت تھی - رائٹنگ
کا بھی اسے جنون کی حد تک شوق تھا - لیکن اس ہدی
آنکھوں والی لڑکی کی محبت تو اس کی رگوں میں خون کی
جگہ گردش کرتی تھی - چاہتا تو زرنور کو ہمراہ لے کر واپس
اپنے وطن لوٹ سکتا تھا -

لیکن یہاں وہ اپنے دوستوں کی وجہ سے بے بس ہو گیا تھا -
جو مختصر سا عرصہ ان کے ساتھ گزارا - وہ اس کے لیے
ساری زندگی کے لیے ناقابل فداموش بن چکا تھا - وہ چاہ
کہ بھی انہیں چھوڑ کر جا نہیں پایا تھا - جس میں زیادہ تر
ہاتھ ان پانچوں کا ہی تھا - جنہوں نے جانے کون کون سے
جنموں کے قسمیں، وعدے دے کر اس کے قدموں میں بیڑاں
ڈال دی تھیں - اور پھر وہ خود بھی کون سا اب وہاں جانا
چاہتا تھا -

اس کی نور اس کا عشق تھی۔ لیکن اس کے دوست بھی
اس کے لیے ایک قیمتی سرمایہ تھے۔

میں حارث ملک! مجھے اپنی نیند سے عشق ہے۔ لیکن
میرے دوست بھی مجھے بے حد عزیز ہیں۔”
بچپن سے لے کر جوانی تک کا سفر انہوں نے ایک ساتھ گزارا
تھا۔ لذتے بھی تھے، جھگڑتے بھی تھے۔ ان دونوں کو ایک
دوسرے کی کچھ عادتوں سے سخت بے زاری بھی تھی۔
لیکن اس کے باوجود انہوں نے ساری زندگی کے لئے ایک
دوسرے کو اپنا ہم سفر چنا تھا۔ مناہل کو بے شک اس کی
انتہا کی نیند بڑی لگتی تھی۔ لیکن وہ اس شخص سے
محبت بھی بے حد کرتی تھی۔ اور جس سے محبت کرتے
ہیں اس کی خامیوں کو بھی تو نظر انداز کرنا چاہئے نا۔
وہ اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ وہ اس کی
بچپن کی محبت تھی۔ وہ اسے خود سے بڑھ کر چاہتا تھا۔
لیکن اتنی ہی محبت وہ اپنے دوستوں سے بھی کرتا تھا۔

میں تیمور ولید! مجھے اپنے پدائے پھڑوں سے عشق ہے۔
لیکن اس سے زیادہ محبت مجھے میرے پانچ دوستوں سے
ہے۔ یہ تو اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ کب یہ مار دھاڑ
والے جداثیم اس کی رگوں میں اتر کر اتنی تعداد میں نشو

نماء پا گئے تھے کہ اب اسے چین سے دو گھٹی بیٹھنا ہی
محال لگتا تھا۔ اس کی زندگی کا محور صرف انہی کے گرد
گھومتا تھا۔ لیکن اس دائیے میں اب ایک اور وجود بھی
شامل تھا۔ جسے حاصل کرنے کے لئے وہ دنیا سے ٹکڑا گیا
تھا۔ یہ شک وہ اس کی عادتوں کی وجہ سے اس سے نالان
رہتی تھی لیکن اسے اپنی چشمیں سے خود سے بڈھ کر
عشق تھا اور اتنا ہی اپنے جان سے عزیز دوستوں سے
بھی۔

”میں حمزہ حیدر علی! دنیا سمجھتی ہے کہ مجھے خود
سے عشق ہے لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ مجھے خود سے
محبت ضرور ہے لیکن خود سے بھی زیادہ مجھے اپنے
دوستوں سے محبت ہے۔“

شہدت کا نشہ اگر کسی کو لوگ جائے تو مشکل سے اس کا
اثر چھوٹتا ہے۔ بچپن سے ہی اس کا دوسروں پر رعب جھاڑ
کر اپنے کام نکلوانا محبوب مشغله رہا تھا۔ جو اپنی وجہت
کے آگے کسی کو خاطر میں بھی نہیں لاتا تھا لیکن صرف
اس کے دوست تھے جن کے سامنے اسے فقط ”حیدر“ ہی
بن کے رہنا پڑتا تھا۔ وہ ان کے سامنے ایم این اے کے بیٹے
ہونے کا تدانہ نہیں بجايا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ کون سا اسے
خاطر میں لایا کرتے تھے۔ زرا جو کبھی ان میں سے کسی

پر گردن اکٹا کر رعب جھاڑی کی کوشش کی۔ وہی ان کا
ایک تھیڈ اس کی گدی پر پڑتا تھا۔

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ خود سے زیادہ بھی وہ
کسی کو چاہ پائے گا۔ لیکن یشفہ کو پانے کے بعد اسے اپنا
آپ مکمل لگئے لگا تھا۔ وہ اس سے بے انتہا محبت کرتا
تھا لیکن اپنے دوستوں پر بھی اتنی ہی جان نثار کرتا تھا۔

”میں اشعر آفریدی! مجھے اپنی روایات سے عشق ہے۔“

لیکن میدے دوستوں میں بھی میدی جان بستی ہے۔“

ایک پڑھان دنیا کے کسی کوئے میں بھی چلا جائے۔ لیکن
اس کی رُگوں میں دوڑتا خون ہمیشہ اپنے اقتدار اور روایات
کے لیے پرچوش رہتا ہے۔

اشعر آفریدی خود کو دنیا کا خوش قسمت مرد سمجھا تھا کہ
جس کی زندگی میں وہ لذکی شامل تھی جس کے ساتھ
کی اس نے تمنا کی تھی۔ جسے حاصل کرنے کے لیے
اسے گھنائیوں سے گزرا نہیں پڑا تھا۔ اسے لائبہ سے
اتنی محبت تھی کہ اسے بازار زندگیاں بھی ملتی تو وہ اس
کا انتخاب کرتا۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے دوستوں
سے بھی اتنی انسیت تھی کہ ہر زندگی میں وہ انہی کا
ساتھ مانگتا۔

"میں ریاض چوہدری! مجھے اپنی بیوی سے عشق ہے۔"

لیکن اس کے بھائی اور اپنے دوستوں پر بھی میں جان دیتا ہوں۔ عشق کے بلند و بالا پہاڑ سر کر کے وہ محبت کا فاتح ٹھہردا تھا۔ مشکلوں سے گھبدا کر اس نے ہار نہیں مانی تھی۔ جس کا صلح اسے اپنی من چاہی محبت کی صورت میں ملا تھا۔ وہ پور پور اس کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس کی ذات کے علاوہ اس کا کسی سے لینا دینا نہیں تھا۔ لیکن ماسوائے اس کے دوستوں کے، جن کے دل بھی اس کے ساتھ دھڑکتے تھے۔

دنیا کو قائم رکھئے ہوئے ستونوں میں سے اگر دوستی اور محبت کو نکال دیا جائے تو شاید ہی دنیا کا وجود بر قدار رہ پائے۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں یہ دونوں نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔

محبت میں عاشق دل دیتا ہے لیکن دوستی میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو ہمیشہ دوستی کو چننا۔ محبت تو اپنی راہ میں لاکر بھٹکا دیتی ہے۔ لیکن صرف ایک دوستی ہی تو ہے جو اندھیرے سفر میں بھی روشن مشعل راہ کی طرح منزل تک ساتھ نہاتی ہے اور جب دوستی اور محبت ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے ایک ہی راہ کے مسافر ہوں تو اس سے بڑھ کر خوش نصیبیں

کسی کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے؟

جنوری کی ندم چمکیلی سی دھوپ سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس وسیع فارم ہاؤس پر ولیمے کی تقدیب جاری و ساری تھی۔

جہاں سب نے دن میں ہو رہی تقدیب کے حوالے سے لائیٹ کلڈز کے لباس منتخب کر رکھے تھے۔ ساتھ میں سب ہی نے کالے چشمے لگائے ہوئے تھے۔ بڑے سے سوئمنگ پول میں ڈھیندوں رنگ بدنگے پہول بکھرے ہوئے تھے۔ جس کے پانی سورج کا سنہدا سا عکس جھلملاتا تھا۔ ظہور دلاور کی وجہ سے کافی ساری سیاسی شخصیات بھی وہاں مدعو تھیں۔

دھیمے سروں میں بجتا میوزک، خوشنما سا ماحول گروپس میں کھٹے باتوں میں مشغول سارے مہمان پر سکون سے تھے۔ لیکن صرف تب تک کے لیے جب تک دولے کے دوستوں کی آمد نہیں ہوئی تھی۔

ہائی ٹیک پر سیاہ کوٹ کے ساتھ گرے آنکھوں کی گھدائیوں کو گاگلڈ سے ڈھکے، وہ دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑ کر، کرسی پر آگے کو ہو کر بیٹھا تھا۔ اس کے بالوں کا رف کٹنگ استائیل اسے سب سے زیادہ منفرد بناتا تھا۔ جس کے سامنے ہی ایک گھٹنے پر بیٹھا حارث ڈی ایس ایل آر کو ہاتھ میں پکڑے

اس کی مختلف تصویر میں اتار رہا تھا۔ ویسے تو وہ تصویروں کا اتنا شوقین نہیں تھا لیکن آج جانے اس کے جی میں کیا آئی تھی۔ اس نے صرف حارث سے ہی تصویریں کھینچنے کے لیے کہا

تھا۔ لیکن اس کے کمینے دوست اپنے اپنے آئی فون کے کیمڈے کھول کر مختلف زاویوں سے اس کی تصویریں کھینچ پہنچ چکے تھے۔

"بگ فین سد! ایک سیلفی پلیز!" ہاتھ میں فون پکڑے حیدر فین مومنٹ میں گھدا، خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ "ایک یاد گار سیلفی تو ہم ضرور لیں گے۔ بس زرا ما انتظار کر۔" احمد نے زومعنی سے لہجے میں کہا۔

"یاد گار سیلفی؟ کہیں تم لوگوں نے کوئی سرپرائز تو پلین نہیں کر رکھا میںے لیے؟ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ "ایسا ویسا" ریاض اور تیمور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ ہنسے تھے۔

"تم کتنی خوش قسمت ہو زر نور کہ تمہیں حیدر جیسا پڑوسی ملا۔" انوشے کی شدارتی سی آواز پر اس نے برا سا منہ بنایا تھا۔

میں اسے اپنی خوش قسمتی نہیں بلکہ نہایت ہی بدی قسمت سمجھتی ہوں۔"

"اچھی قسمت ہو یا بدی قسمت ! لیکن نصیب دیکھو تم اپنے کہ میں تمہاری ہی قسمت میں لکھا ہوا ہوں" - زرنور حیدر کا ذکر کرے اور وہ حاضر نہ ہو جائے۔

یہ تو ناممکن تھا۔ تھدی میں وہ انتہا کا ڈیشنگ لگ رہا تھا۔ اپنی وجہ سے وہ انجان نہیں تھا، تبھی تو گردن فخر سے اکٹائی ہوئی تھی۔

"حیدر تیرا سرپرائز !" ریاض نے پیچھے سے اس کے کندھے کو تھپتھپا کر متوجہ کیا تھا۔

سد پرائز سے یاد آیا تم لوگوں نے مجھے سلامی نہیں دی ابھی تک "۔ وہ جیسے ہی کہتے ہوئے مڑا۔ پشت پر ہاتھ باندھے وہ ایک لائن میں اس کے سامنے کھڑے تھے۔

کیا ؟ وہ حیران پریشان سا کھڑا کچھ سمجھے ہی نہیں پایا تھا کہ احمد نے اچانک ہی پشت سے ہاتھ نکال کر اس کی جانب کچھ اچھا لانا تھا۔ وہ دنگ کھڑا رہ گیا تھا۔

حیدانگی سے اپنے سوٹ کا حال دیکھا۔ جہاں نیلے رنگ کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اور صرف وہ احمد ہی نہیں تھا جس نے رنگین پانی سے بھرا غبارہ اسے مارا تھا۔ اس کے آغاز کرتے ہی مانو، غباروں کی برسات تھی جو تڑ تڑ حیدر کے اوپر برسی تھی۔ صرف منٹوں میں ہی وہ مختلف رنگوں سے نہا گیا تھا۔

"میرا دلیمہ سے آج !" اپنا حال دیکھ کر تو وہ دہل ہی گیا تھا۔

منحوسوں! نے غیدتوں! آج ہی کا دن ملا تھا بدلتے لینے کے
لئے؟" وہ جتنا ان کی منتیں کرنے کے بعد انہیں صلواتیں
سنارہا

تھا، وہ لوگ-- اتنی ہی تعداد میں رنگ اس پر پھینک رہے
تھے۔

کچھ دید پہلے کا ماحول جتنا پر سکون تھا۔ اب وہاں کا نقشہ
بلکہ ہی اللٹا پڑا تھا۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے
تھے۔

احمد نے اپنا فون نکال کر فرنٹ کیمڈہ کھولا تھا۔ وہ سارے
جهٹ اس کے پیچھے وکٹی کا وی بنا کر کھٹے ہو گئے۔
”من و و رنگباز دولہا!

اسے رنگ باز نہیں بلکہ رنگین دولہا سیفی کلک ہوتے ہی
ہوٹنگ کرتے ہوئے ان سب نے ایک بازو کو خم دے کر
آنکھوں پر رکھے، دوسرے ہاتھ کو فضاء میں سیدھا کیے،
وہاں شور سا ڈال دیا تھا۔

حیدر کو تو دیکھ کر پہچانا ہی نہیں جاسکتا تھا کہ یہ کچھ دید
پہلے کا وہ لڑکا ہے جو شہزادوں کو بھی مات دے رہا تھا۔
اور اب یہ حال تھا کہ کپڑوں پر، چہرے پر یہاں تک کہ اس
کے کئی گھنٹے لگا کہ بنائے گئے ائیر استائل پر بھی
رنگوں نے پانی پھیرد دیا تھا۔ اور پھر صرف حیدر ہی نہیں
تھا کہ جس کا حشر بگڑا تھا۔ باقیوں کے حال بھی اس سے

مختلف نہیں تھے۔

انہیں فکر نہیں تھی کہ ان کے ڈیزائن لباس کتنے مہنگے تھے۔ انہیں یہ بھی بھول گیا تھا کہ آج کی تقدیر کے لیے انہوں نے کتنی محنت اور ٹائم لگا کر تیاری کی تھی۔ ہر سکھ دکھ کے وہ ہمیشہ سے ساتھی رہے تھے۔ جن کی زندگیوں پر بھی خود سے زیادہ باقیوں کا حق تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی ذات کو پہلے نہیں رکھتا تھا۔ بے شک زبان سے اعتراف نہیں کرتے تھے۔ لیکن وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

دوستی اور محبت کے بے لوٹ رنگوں سے بھی ہزاروں، لاکھوں کھانیاں دنیا میں بکھری پڑی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ داستان بھی آج اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔ اختتام بھی ایسا کہ جس کے بعد ایک اور خوبصورت سا آغاز ان کا منتظر تھا۔

"اے دوست!

جی چاہتا ہے کہ کائنات کی
ساری خوشیاں تید سے قدموں میں
ڈھیر کر دوں -

میں اپنی سانسیں
تید سے نام کر دوں -
کبھی زمانے کے غم

تجھے چھو کر نہ گزریں -

میں اپنی جان

تیر سے نام کر دوں -

ہو اگر تجھ کسی چیز کی فکر

دے کہ تیر سے ہونٹوں پر مسکدابٹ ،

میں تجھے ہر فکر سے آزاد کر دوں - - -

کبھی نہ چھوٹے ساتھ ہمارا

میں رب سے یہ دعا کر دوں -

میں اپنی ساری کامیابیاں

تجھ پر قدیماں کر دوں -

چھو کر نہ گزرے تجھے زمانے کا غم ،

خوشیوں کے پھول

میں تجھ پر نچراور کر دوں - - -

----- ختم شد -----

www.zubinovelszone.com